ذوالفقار علی بھٹو کا قتل کیسے ہوا؟

حقائق سے پردہ اٹھتا ہے

فرخ سہیل گوئندی

www.bhutto.org

ذوالفقار علی بھٹو کا قتل کیسے ہوا؟

حقائق سے پردہ اُٹھتا ہے

مرتب: فرخ سہیل گوئندی

جمہوری پبلیکیشنز

www.bhutto.org

Independent & Progressive Books

• نام کتاب۔ ذوالفقار علی بھٹو کا قتل کیسے ہوا؟ حقائق سے پردہ اٹھتا ہے
• مرتب: فرخ سہیل گوئندی • اشاعت۔ اپریل 2011ء
• سرورق: مصباح سرفراز • ناشر۔ جمہوری پبلیکیشنز لاہور
• جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

ISBN:978-969-8455-71-2

قیمت۔/150 روپے

اہتمام:
فرخ سہیل گوئندی

اس کتاب پر تبصرے کے لیے ناشر یا مصنف سے اجازت کی کوئی ضرورت نہیں۔ کتاب کے کسی بھی حصے کو ریویوز یا تبصرے کے طور پر استعمال کیا جائے تو کتاب، مصنف اور ناشر کا حوالہ دینا لازم ہے۔

www.jumhoori.webs.com

Jumhoori Publications Fan Page

JUMHOORI PUBLICATIONS
2-Aiwan-e-Tijarat Road Lahore. Pakistan
Tel # 042-36314140 Fax # 042-36306939
E-mail:jumhoori@yahoo.com

www.bhutto.org

انتساب

آغا ندیم

اور اُن تمام سیاسی کارکنوں کے نام

جنہوں نے 5 جولائی 1977ء کو مسلط کردہ آمریت کے خلاف

ذوالفقار علی بھٹو شہید کے پرچم تلے علمِ بغاوت بلند کرتے ہوئے

تاریخ ساز جدوجہد کی

www.bhutto.org

فہرست

تاریخ کی عدالت	7
ذوالفقار علی کا عدالتی قتل	9
جنرل ضیاء الحق، ذوالفقار علی بھٹو کا خوشامدی	15
وہ تاریک رات۔۔۔مارشل لاء کا نفاذ	19
احمد رضا قصوری کے باپ کے قتل کی حقیقت	21
بھٹو کے خلاف انتخابات میں دھاندلی کی حقیقت	29
امریکی مداخلت اور بھٹو کا مقدمہ	33
تاریخ سے پردہ اُٹھتا ہے	37
تعصب اور سازش	49
پھانسی گھاٹ کا گواہ	57
رحم نہیں انصاف چاہتا ہوں	93
بلیک وارنٹ اور سزائے موت	97
بھٹو پھانسی پر جھول گئے	105
تین ججوں کے ریمارکس	109

تاریخ کی عدالت

جنرل ضیاء الحق نے 5 جولائی 1977ء کو عین اس وقت منتخب حکومت جس کی سربراہی وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کر رہے تھے کا تختہ الٹ دیا، کہ جب اس کے 9 سیاسی جماعتوں کے اتحاد (پاکستان قومی اتحاد) کے ساتھ مذاکرات حتمی نتیجے، یعنی دوبارہ انتخابات کروانا طے پا چکے تھے۔ جنرل ضیاء الحق نے منتخب حکومت کا تختہ الٹنے کے ساتھ ہی پاکستان کا آئین بھی معطل کر دیا۔ اس کے بعد چیف جسٹس جناب یعقوب علی کو گھر بھیج دیا گیا اور اُن کی جگہ جسٹس انوار الحق کو چیف جسٹس نامزد کر دیا گیا۔ یہ سارے انتظامات ایک طول منصوبہ بندی کے تحت کیے گئے تھے، جس کی منصوبہ بندی چند گھنٹوں یا دنوں میں نہیں بلکہ مہینوں پہلے کی گئی تھی، جنرل ضیاء الحق نے تختہ الٹنے کی اس سازش کا نام ''آپریشن فیئر پلے'' رکھا، وہ کتنا 'فیئر پلے' کرتا رہا اس کی گواہی اب تاریخ دے رہی ہے۔

اس سارے ڈرامے کا اہم سین 3 ستمبر کو ذوالفقار علی بھٹو کی گرفتاری تھی۔ اس گرفتاری کے بعد اُن کے خلاف نواب محمد احمد خان کے قتل کی ایف آئی آر جو 1975ء میں کاٹی گئی تھی پر عمل کرتے ہوئے قتل کے مقدمے کا آغاز کیا گیا۔ اس مقدمے کی تیاری چند دنوں میں کیسے ممکن ہو گئی یہ خود ایک سوال ہے، جس سے اُس میں سازش صاف نظر آتی ہے۔ اس مقدمے میں فیڈرل سکیورٹی فورس (ایف ایس ایف) کے معزول سربراہ مسعود محمود اور ایک ملازم (ایف ایس ایف) غلام حسین کو سلطانی گواہوں کے طور پر پیش کیا گیا۔ مسعود محمود جو کہ مارشل لاء کی حراست میں تھے کو دورانِ حراست ہی سلطانی گواہ بننے پر مجبور کیا گیا۔ جس سے اُن کے سلطانی گواہ بننے کی قانونی اور اخلاقی حیثیت مشکوک ہو جاتی ہے۔ اس مقدمے میں ذوالفقار علی بھٹو کو سازش تیار کرنے کا مجرم

ثابت کیا گیا، جس کی سزا، سزائے موت نہیں ہوسکتی۔ یہ مقدمہ نچلی عدالت سے فوری طور پر لاہور ہائی کورٹ منتقل کر دیا گیا، جو کہ عدالتی انصاف کے تقاضوں کے منافی قدم تھا، پھر اس مقدمے کی چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین کی قیادت میں فل بنچ کے ذریعے کارروائی کی گئی، مولوی مشتاق حسین کے بارے میں ذوالفقار علی بھٹو نے بار بار عدالت کو آگاہ کیا کہ وہ تعصب رکھتا ہے اس لیے وہ اس کارروائی سے علیحدہ ہو جائے، ذوالفقار علی بھٹو نے کہا کہ بطور وزیراعظم انہوں نے مولوی مشتاق حسین کو چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ نہیں لگایا تھا، اسی لیے اس کا رویہ اُن کے خلاف تعصب کی بنیاد پر ہے۔ لاہور ہائی کورٹ میں کارروائی میں قانونی سقم نہیں بلکہ بڑے شگاف ہیں۔ اس کے بعد سپریم کورٹ میں ذوالفقار علی بھٹو کی اپیل 9 رکنی بنچ نے کی، جس میں ایک جج ریٹائرڈ کر دیئے گئے اور دوسرے بیمار ہو گئے، اس طرح بنچ درحقیقت غیر مکمل ہو گیا اور پھر جب اپیل پر فیصلہ آیا تو بھی یہ مقدمہ اپنی ساکھ متاثر کر گیا کہ 4 ججوں نے سزائے موت بحال رکھی جبکہ 3 نے بری کر دیا اور پچھلے 32 سالوں میں اس مقدمہ قتل کو کسی عدالت میں ریفرنس کے طور پر پیش نہیں کیا گیا جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس مقدمہ کی کارروائی میں قانونی شگاف تھے۔

ذوالفقار علی بھٹو کو تین محاذوں پر قاتل قرار دیا گیا۔

1۔ حکومت اور اس کی مشینری جس کی قیادت ضیاء ٹولہ کر رہا تھا

2۔ عدالت اور اس سے تعلق رکھنے والے لوگ

3۔ پرنٹ میڈیا پر چھائے ضیاء الحق کے پروردہ

لیکن وقت نے ذوالفقار علی بھٹو کو قومی ہیرو قرار دے دیا۔ خود ذوالفقار علی بھٹو نے عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر کہا تھا کہ وقت ثابت کرے گا کہ کیا میں ملزم ہوں جس کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا گیا ہے یا کہ وہ مجرم ہیں جنہوں نے مجھے کٹہروں میں کھڑا کرنے کا انتظام کیا ہے۔

فرخ سہیل گوئندی

4 اپریل 2011ء

لاہور

ذوالفقار علی بھٹو کا عدالتی قتل

فرخ سہیل گوئندی

ذوالفقار علی بھٹو نے جس ہنگامہ خیز دور میں عوامی سیاست کا آغاز کیا، وہ اور ملکی عالمی سطح پر نظریاتی صف بندی کا دور تھا، انہوں نے پہلی بار پاکستان میں بائیں بازو کی سیاست کو عوامی سطح پر مقبول انداز میں پیش کیا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ان کی مخالفت میں دائیں بازو کے سیاسی گروپس اور دیگر رجعت پسند ریاستی ادارے تو تھے ہی مگر بائیں بازو کے انتہا پسند بھی تھے۔ وہ ذوالفقار علی بھٹو کے اسی قدر مخالف تھے جس قدر دائیں بازو کے لوگ۔ ذوالفقار علی بھٹو نے بائیں بازو کے عوامی نظریات کو دانشورانہ بحثوں سے نکال کر گلی، محلے، کھیتوں، کھلیانوں، کارخانوں، سکولوں اور کالجوں میں متحرک کر دیا اور یوں پاکستان کی سیاست بھٹو کے حامیوں اور مخالفوں میں تقسیم ہو گئی۔

بھٹو اپنے مخالف محاذ کے سامنے جس میں دائیں بازو کی تمام سیاسی جماعتیں، بائیں بازو کی انتہا پسند قوتیں اور تمام ریاستی مشینری شامل تھی اپنے عوامی نظریات کی بنیاد پر بڑے دبنگ انداز میں میدان سیاست میں نمایاں ہو گئے، کیونکہ سماج کے حقیقی محنت کش، درمیانہ طبقہ، نوجوان طلبا اور خواتین نے کھل کر ان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف دائیں بازو کی سیاسی قوتیں اور ریاستی مشینری میں شامل رجعت پسند ادارے ذوالفقار علی بھٹو کے ترقی پسند نظریات کے مخالف تھے اور ان کو یقین تھا کہ اگر ذوالفقار علی بھٹو پاکستان میں ایک حقیقی عوامی جمہوری انقلاب کو

کامیابی سے ہمکنار کر لیتے ہیں تو اس طرح نو آبادیات کی بنیاد پر قائم ریاستی ڈھانچہ ختم ہو جائے گا جو ان رجعتی قوتوں کا واحد سہارا ہے اور دوسری طرف بائیں بازو کے انتہا پسند دانشور ذوالفقار علی بھٹو پر بالکل اسی طرح الزام تراشی کر رہے تھے، جیسے مذہبی ملا مغرب پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ ''انہوں نے اسلام کے فلاحی اصول چوری کر لیے ہیں جن کی بنیاد پر مغرب ترقی یافتہ ہو پایا۔''

پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے ایک طویل منصوبہ بندی کی گئی اور ان قوتوں نے بھٹو کو شیطان قرار دینے کی کوشش کی۔ ذوالفقار علی بھٹو کی سیاست کا کینوس پاکستان تک ہی محدود نہیں تھا، وہ تیسری دنیا کی سیاست میں بھی اپنا ایک مقام رکھتے تھے، اسی لیے سرد جنگ کے ان آخری سالوں میں روز بروز زور پکڑتی سامراجی قوت امریکہ ذوالفقار علی بھٹو کو اپنے علاقائی مفادات کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ تصور کرتا تھا۔ اس کے لیے جو منصوبہ بندی کی گئی، اس میں جناب ذوالفقار علی بھٹو کو صرف اقتدار سے علیحدہ کرنا ہی نہیں تھا، بلکہ ان کی کردار کشی سرفہرست تھی، جس میں ان کو قاتل، خائن، منتقم، غدار، کافر اور شیطان کے طور پر پیش کرنا تھا۔ اس ساری مہم میں پاکستانی ذرائع ابلاغ انتہائی گھناؤنا کردار ادا کیا۔

یہ طے کیا گیا تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو کی کردار کشی کے بعد انہیں جسمانی طور پر ختم کر دیا جائے۔ لاہور ہائی کورٹ میں جب ان کے خلاف مقدمہ قتل چل رہا تھا تو چیف جسٹس مولوی مشتاق نے ان کے لیے ایک خصوصی کٹہرا بنوایا اور جب ان کو سزائے موت کا سزاوار ٹھہرایا گیا تو عدالت نے ذوالفقار علی بھٹو کو صرف نام کا مسلمان قرار دیا اور دوران مقدمہ اور فیصلے میں جناب ذوالفقار علی بھٹو کو ''بڑا ملزم'' قرار دیا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی کردار کشی کی اس مہم میں ریاستی مشینری، دائیں بازو کی قوتیں اور ان کا حامی میڈیا ہراول دستے کا کام کر رہا تھا۔ مقصد ایک ہی تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو کو ''عبرتناک مثال'' بنا کر پیش کیا جائے تا کہ آئندہ کوئی شخص جاگیرداری، سرمایہ داری اور امریکی مفادات کے خلاف چیلنج بن کر سامنے نہ آئے۔ جنوری 1977ء میں بھٹو حکومت نے عام انتخابات کا اعلان کیا تو ان کے خلاف دائیں بازو کی 9 جماعتیں پاکستان قومی اتحاد کے نام پر اکٹھی ہو گئیں۔ پہلے انہوں نے مارچ 1977ء میں انتخابات میں دھاندلی کا الزام لگایا اور پھر یکا یک نظام مصطفیٰ کی تحریک کا اعلان کر دیا، اس دوران پاکستان میں بے دریغ امریکی ڈالرز

آئے اور ڈالر کی قیمت حیرت انگیز حد تک گر گئی۔ اس ڈرامے کا آخری منظر 5 جولائی 1977ء کو چیف آف سٹاف جنرل ضیاالحق کی طرف سے پاکستان میں مارشل لا مسلط کیا جانا تھا۔ عدالت عظمیٰ نے آئین معطل کرنے والوں کو نظریہ ضرورت جیسی اصطلاح گھڑ کر قانونی حیثیت دے دی اور پھر ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف کردار کشی کی مہم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انہیں کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا۔

3 ستمبر 1977ء کو ذوالفقار علی بھٹو کو گرفتار کر کے لاہور لایا گیا، جہاں ان کو مارشل لاء حکام نے لاہور چھاؤنی کی ایک ملٹری رہائش گاہ میں منتقل کیا گیا۔ 8 ستمبر کو جنرل ضیاء الحق نے تسلیم کیا کہ مسٹر بھٹو کو احمد رضا قصوری کے والد کے قتل کے الزام میں لاہور کے ایک مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا ہے پھر یکا یک مقدمہ سیشن کورٹ میں منتقل کر دیا گیا اور وہاں سے مولوی مشتاق حسین نے یہ مقدمہ اپنی عدالت میں منتقل کر لیا۔ اس دوران جسٹس کے ایم صمدانی نے ذوالفقار علی بھٹو کو 13 ستمبر 1977ء کو ضمانت پر رہا کر دیا لیکن پنجاب ہائی کورٹ نے فوراً ہی مسٹر بھٹو کی ضمانت منسوخ کر دی۔ پنجاب ہائی کورٹ میں 6 ماہ تک مقدمے کی کارروائی کے بعد 18 مارچ 1978ء کو ذوالفقار علی بھٹو کو موت کی سزا کا حکم سنایا گیا۔ 405 صفحات پر مشتمل فیصلہ جسٹس آفتاب حسین نے لکھا۔ مولوی مشتاق حسین نے فیصلے کے آخری پانچ صفحات پڑھ کر سنائے۔

ایف ایس ایف کے سربراہ مسعود محمود کو مارشل لاء حکومت نے 5 جولائی 1977ء کو ''حفاظتی تحویل'' میں لے لیا تھا۔ وہ اس مقدمے میں سلطانی گواہ کے طور پر پیش ہوا۔ جبکہ سابق ڈائریکٹر ایف ایس ایف، میاں محمد عباس، انسپکٹر غلام مصطفیٰ، سب انسپکٹر ارشد اقبال اور سب انسپکٹر افتخار احمد کو بھی ذوالفقار علی بھٹو کے ہمراہ برائے موت کا حق دار ٹھہرایا گیا۔ اس فیصلے میں متعدد قانونی تضادات تو اپنی جگہ موجود ہیں ہی لیکن بنیادی طور پر اس مقدمے کے فیصلے کی بنیاد مسعود محمود اور غلام حسین کی وعدہ معاف گواہی کے علاوہ ایف ایس ایف کے چاروں اہل کاروں کے اعترافی بیانات ہی بنے۔ جب نواب محمد احمد خان کے قتل میں ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف ایف آئی آر کاٹی گئی تو راؤ رشید پنجاب کے آئی جی تھے۔ اس مقدمے کی حقیقت کا کچھ اندازہ راؤ رشید کے بیان سے لگایا جا سکتا ہے۔

''یہ قتل اس وقت ہوا تھا، جب میں آئی جی پولیس پنجاب تھا۔ قید کے دوران فوجی حکام نے مجھ پر دباؤ ڈالا کہ میں مقدمے کے سرکاری گواہ کے طور پر پیش ہو جاؤں اور استغاثہ کی تائید کروں۔ میں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کی بجائے میں نے مسٹر بھٹو سے کہا کہ استغاثہ کے دعوے کو غلط ثابت کرنے کیلئے ان کے دفاع میں گواہ کے طور پر پیش ہونے کو تیار ہوں۔

چونکہ مجھے مسٹر بھٹو کو پھانسنے کے لئے تیار کردہ جال کے لئے خطرہ تصور کیا جاتا تھا، اس لئے مجھے اس وقت تک قید رکھا گیا جب تک عدالت نے انہیں خطاوار قرار دے کر سزائے موت نہیں دے دی۔ مسٹر بھٹو نے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی، اس کے ساتھ میرا بیانِ حلفی بھی منسلک تھا، جس نے استغاثے کے موقف کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ سپریم کورٹ میں مسٹر بھٹو کی اپیل کی سماعت سے پہلے لاہور میں رانا افتخار کا چھوٹا بھائی مجھے ملنے آیا۔ رانا افتخار نے اس مقدمہ قتل میں اعترافی بیان دیا تھا جس کی بنیاد پر اسے بھی دو دیگر ملزمان کے ہمراہ سزائے موت سنائی گئی تھی۔ اس نوجوان نے مجھے بتایا کہ ان لوگوں کے ساتھ بڑا دھوکا ہوا ہے اور وہ میری مدد لینے آیا ہے۔ اس نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ جنرل چشتی نے مارشل لا ہیڈ کوارٹر میں اس کے بھائی رانا افتخار کو بلا کر کہا تھا کہ اگر وہ استغاثے کی کہانی کی تائید کریں تو انہیں معافی دے دی جائے گی یا معمولی سزائیں دی جائیں گی، جنہیں آخر کار معاف کر دیا جائے گا۔ مولانا طفیل محمد نے بھی جو ملزم سب انسپکٹر ارشد اقبال کے ہمسایہ تھے، ضمانت دی۔ ان کے خاندان کو اُمید تھی کہ مقدمے کے اختتام پر اس کے بھائی کو رہا کر دیا جائے گا لیکن جب اسے مسٹر بھٹو کے ساتھ سزائے موت سنا دی گئی ہے تو وہ دم بخود رہ گئے۔ (از ''جو میں نے دیکھا'' راؤ رشید)

پنجاب ہائی کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں ایک اپیل دائر کی گئی۔ 27 مارچ 1978ء کو چیف جسٹس انوار الحق نے پانچ ججوں پر ایک بنچ قائم کیا۔ جن میں انوار الحق، دراب پٹیل، قیصر خان، محمد سلیم اور جسٹس صفدر شاہ شامل تھے۔ 20 مئی کو مسٹر بھٹو نے چیف جسٹس انوار الحق پر عدم اعتماد کا اظہار کیا، اس کے بعد 9 ججوں پر ایک نیا بینچ قائم کیا گیا جن میں جسٹس وحید الدین، جسٹس محمد اکرم، جسٹس نسیم حسن شاہ اور جسٹس کرم الٰہی چوہان شامل تھے۔ بعد میں جسٹس قیصر خان کو ریٹائر کر دیا گیا، جبکہ دو ایڈہاک ججز وحید الدین اور نسیم حسن شاہ کی مدت

ملازمت میں توسیع کر دی گئی اور پھر یکا یک 21 نومبر 1978ء کو جسٹس وحیدالدین کو ریٹائر کر دیا گیا۔ جس سے آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فوجی حکومت عدالت کے معاملات میں کس طرح مداخلت کر رہی تھی۔

اگرچہ ابھی تک ذوالفقار علی بھٹو کے قتل کے لیے تیار کردہ استعماری سازش کے مستند دستاویزی ثبوت سامنے نہیں آئے لیکن اگر ہم مسٹر بھٹو کی سیاست، پاکستان کے اندرونی وبیرونی معاملات کی کڑیاں جوڑنا شروع کریں تو یہ منکشف ہوتا ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کو قتل کرنے کے لیے ایک عالمی سازش کارفرما تھی جس کے پاکستان کے اندر کئی مہرے تھے۔ غیر ملکی اور داخلی رجعتی قوتوں نے سازش کے ذریعے ذوالفقار علی بھٹو کو جسمانی طور پر تو ختم کر دیا، مگر ذوالفقار علی بھٹو ناانصافیوں سے ماورا ہو گئے۔ آج تین دہائیوں کے بعد تاریخ کی عوامی عدالت نے ان کے حق میں فیصلہ دے دیا ہے اور وہ شخص جسے ریاستی مشینری، میڈیا اور رجعتی قوتیں شیطانی روپ میں پیش کرنے کے لیے "سر دھڑ کی بازی" لگاتی رہیں، ایک غیر متنازعہ سیاسی بطل رشید کے روپ میں ابھر کر سامنے آ گیا ہے۔ اب ہر مکتب فکر ذوالفقار علی بھٹو شہید کو پاکستان اور تیسری دنیا کا ایک مخلص لیڈر گردانتا ہے اور جو لوگ عدالتوں میں "منصف" کی حیثیت سے بٹھائے گئے، وہ عوام میں اپنے جانبدار ہونے کا اعتراف کر رہے ہیں۔ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو جس سیاست کی سربلندی کے لیے تختہ دار پر چڑھائے گئے، اس سیاست کا پرچم بلند کرنے کے دعوے تو کیے گئے، لیکن ابھی تلک حقیقتاً ایسا نہیں ہوا۔ تاہم تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ وہ وقت ضرور آئے گا، جب 4 اپریل 1979ء کو تختہ دار پر جھولنے والے ذوالفقار علی بھٹو کی مشعل دوبارہ روشن کی جائے گی۔ یہ مشعل وہی لوگ اٹھائیں گے جو ذوالفقار علی بھٹو کی طرح انقلابی تصورات رکھتے ہیں اور عوام کی طاقت پر یقین رکھتے ہیں۔

جنرل ضیاء الحق، ذوالفقار علی بھٹو کا خوشامدی

خالد فتح محمد

۱۱ کیولری (فرنٹیئر فورس) مئی 1849ء کو کھڑی کی گئی تھی۔ 1972ء میں لیفٹیننٹ کرنل ضیاء الدین جاوید اس کے کمانڈر پوسٹ بن کر آئے۔ انہوں نے یونٹ کی باگ ڈور سنبھالنے اور یونٹ کو اپنی حکمت عملی کے مطابق رخ دینے کے بعد ایک دن اعلان کیا کہ وہ یونٹ کے ایک سو پچیس سالہ یوم تاسیس پر وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو بطور مہمان خصوصی بلائیں گے۔ شروع میں کسی نے اس اعلان کو اہمیت نہ دی۔ ضیاء الدین جاوید ایک سال سے زیادہ عرصے تک آرمرڈ کور سنٹر، جی ایچ کیو کے مختلف ڈائریکٹرز اور وزیر اعظم سیکرٹریٹ کے ساتھ خط کتابت کرتے رہے۔ بالآخر جی ایچ کیو سے اجازت مل گئی تو وزیر اعظم کی دست یابی کا مسئلہ درپیش تھا۔ ضیاء الدین جاوید چاہتے تھے کہ تقریب ایک تو سال کے دوسرے حصے میں ہو اور دوسرے خوشگوار موسم میں ہو۔ وزیر اعظم نے روس کے دورے کے بعد اکتوبر میں دونوں کے لئے آنے کا فیصلہ کیا اور یہ اطلاع جی ایچ کیو اور رجمنٹ کو پہنچا دی گئی۔

یونٹ میں وزیر اعظم کا آنا ایک بہت اہم Event ہوتا ہے۔ اس تقریب کو ترتیب تو یونٹ نے دینا ہوتا ہے لیکن نگرانی کرنے اور ہدایات دینے کے لئے کئی ادارے بیچ میں کود پڑتے ہیں اور ایک وقت آتا ہے کہ اس تقریب کو ہائی جیک کر لیا جاتا ہے۔ ضیاء الدین نے خط کتابت کے دوران یہ اندازہ لگا لیا تھا اور وہ کہا کرتے تھے کہ وہ ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ جیسا کہ ہوا کرتا

ہے؟ تقریب کو عملی جامہ پہنانے سے تھوڑا عرصہ پہلے معمول کی تبدیلیوں کے تحت انہیں تبدیل کر کے ملتان بھیج دیا گیا اور یونٹ میں نئے کمانڈر آ گئے۔

یونٹ اس وقت کھاریاں میں تھی اور میجر جنرل سید وجاہت حسین 6 آرمرڈ ڈویژن کو کمانڈ کر رہے تھے۔ میجر جنرل وجاہت نے وزیراعظم سیکرٹریٹ کو لکھا کہ 11 کیولری (فرنٹیئر فورس) کی تقریب کے دوران وزیراعظم جی او سی 6 آرمرڈ ڈویژن کے مہمان ہوں گے اور جی او سی ہاؤس ان کے لئے خالی کر دیا جائے چند دنوں کے اندر وزیراعظم کی طرف سے خط موصول ہوا جس کا متن درشت اور کسی قسم کی پیچیدگی سے مبرا تھا کہ وزیراعظم پاکستان کسی کا مہمان نہیں ہوتا اور دونوں کے لئے جی او سی 6 آرمرڈ ڈویژن کا گھر Requisition کر کے وزیراعظم ہاؤس بنا دیا جائے گا۔ میجر جنرل (بعد میں جنرل اور صدر پاکستان) ایم ضیاء الحق اس وقت آرمرڈ کور کے سب سے سینئر حاضر سروس افسر تھے۔ ان دنوں میں وہ آرمرڈ ڈویژن ملتان کے کمانڈر تھے۔ وہ تقریب کے لئے مدعو تھے اور ان دو دنوں میں انہوں نے بھی ایک الگ تقریب کا اہتمام کرایا ہوا تھا جس میں بھٹو صاحب کو پاکستان آرمرڈ کور کا اعزازی کرنل ان چیف بنانا تھا۔ جنرل ضیاء بس میں آئے اور کھاریاں چھاؤنی پر اتر کر انہوں نے ملٹری پولیس کی چیک پوسٹ سے یونٹ میں ٹیلی فون کیا۔ جنرل ضیاء الحق اور ڈیوٹی آفیسر کے درمیان مندرجہ ذیل مکالمہ ہوا۔

جنرل ضیا: میں ضیاء بول رہا ہوں۔ چیک پوسٹ پر میرے لئے سٹاف کار بھجواؤ۔

ڈیوٹی آفیسر۔ (ڈیوٹی آفیسر یونٹ کرنل ضیاء الدین کے ساتھ کافی بے تکلف تھا) سر آپ کو سٹاف کار کب سے Authorize ہو گئی؟

جنرل ضیاء: (چیختے ہوئے) میں جنرل ضیاء بول رہا ہوں۔

ڈیوٹی آفیسر نے فون بند کیا، اپنی ٹوپی پہنی اور جنرل ضیاء کے لئے نامزد کی گئی سٹاف کار کے ڈرائیور کو ہدایات دیئے بغیر کمرے میں جا کر قانونی کارروائی کے انتظار میں بیٹھ گیا جو بوجوہ عمل میں نہیں لائی گئی۔

اگلے دن بھٹو صاحب کو اعزازی کرنل ان چیف بنانے کی تقریب تھی۔ جنرل ضیاء نے بھٹو صاحب کو پیش کی جانے والی اعزازی تلوار کو ذوالفقار علی کہا اور ان کی شان میں تعریف

کر کے زمین اور آسمان ایک کر دیئے۔ وہ تعریف اتنی زیادہ تھی کہ تمام افسر کسی حد تک شرم سار ہو رہے تھے۔

دوپہر کو بھٹو صاحب کا ۱۱ کیولری (فرنٹیئر فورس) کی میس میں کھانا تھا۔ اس کھانے میں آرمرڈ کور کے تمام اہم افسران مدعو تھے۔ کھانے کے بعد رجمنٹ کے افسروں کے ساتھ بیگم نصرت بھٹو اور بھٹو صاحب کا گروپ فوٹو بنایا جانا تھا۔ بیگم نصرت بھٹو گروپ کے درمیان بھٹو صاحب کے ساتھ کھڑی ہوئیں تو بھٹو صاحب نے قدرے رکھائی سے کہا۔

"Stand to a side- Let these boys stand next to me"

بیگم نصرت بھٹو نے رجمنٹ کے افسروں کے لئے جگہ بنا دی۔

۱۱ کیولری (فرنٹیئر فورس) کے ایک سو پچیس سالہ یوم تاسیس کی تقریب کو جنرل ضیاء نے ہائی جیک کر لیا۔ انہوں نے بھٹو صاحب کو اعزازی کرنل ان چیف بنانے کو مرغ دام کے طور پر استعمال کیا۔ یہ ان کی Grand Strategic Deception کا پہلا مرحلہ تھا۔

(ماہنامہ "صدائے جمہور" اپریل 2010ء)

وہ تاریک رات.....
مارشل لاء کا نفاذ

سہیل سیٹھی

یہ 4 اور 5 جولائی 1977ء کی درمیانی شب تھی۔ شاہ نواز اپنے کمرے میں جا چکے تھے اور محوِ خواب تھے۔ میں میر مرتضیٰ کے ہمراہ انکے بیڈروم میں بیٹھا گپ شپ لگا رہا تھا کہ دور سے ایک نسوانی آواز۔ میر۔ میر کہتی ہوئی قریب آتی گئی۔ اچانک بیڈروم کا دروازہ کھلا اور صنم بھٹو داخل ہوئیں۔ انکے پیچھے پیچھے بھٹو صاحب کا معتمد ملازم نور محمد مغل (عرف نورا) تھا۔ صنم نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا "ARMY HAS TAKEN OVER" اس نے مختصراً تفصیل بتائی کہ کس طرح وزیراعظم ہاؤس کو گھیرے میں لے لیا گیا ہے۔ اس دوران شاہ نواز بھی آ گئے۔ ابھی یہ باتیں اور اسکے مضمرات پر بات ہو ہی رہی تھی کہ پھر بیڈروم کا دروازہ کھلا اور اچانک کمرے میں بھٹو صاحب داخل ہوئے۔ وہ اس وقت شب خوابی کے گاؤن میں ملبوس تھے۔ بیگم بھٹو انکے ہمراہ تھیں۔ بھٹو صاحب کے چہرے پر انتہائی سنجیدگی تھی اور وہ کسی گہری سوچ میں تھے۔ وہ کچھ دیر خاموش کھڑے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے میر مرتضیٰ اور شاہنواز کو ہدایات دینی شروع کر دیں۔ جنکے مطابق دونوں کو ضروری سامان پیک کر کے صبح کراچی چلے جانا تھا۔ بھٹو صاحب کچھ دیر کمرے میں موجود رہے۔ بچوں سے باتیں کرتے رہے۔ ریاست اور سیاست کے جھمیلوں سے آزاد "پاپا" پھر اپنے میر اور اپنی صنی (صنم) کے درمیان آنے والے پرآشوب دور کیلئے کمر کس رہا تھا۔ اقوام عالم اور اس ملک کے غریب عوام۔ راولپنڈی میں ہونے والے اس ڈرامے سے ہنوز بے خبر تھے۔ جب

www.bhutto.org

چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرا۔ سیاہ بادلوں کی اوٹ سے ٹمٹماتا یہ ستارہ اس وقت بھی اسی آن سے چمک رہا تھا۔

بھٹو صاحب نے بچوں کو چند نصیحتیں کیں۔ کیونکہ بھٹو صاحب کا طریقہ کار رہا تھا کہ جب بچے یکجا ہوتے تو انکی ماضی کے واقعات کے حوالے سے تربیت کرتے رہتے تھے اور بچوں سے دوری کی شکل میں اکثر وہ انہیں بذریعہ تحریر حالات سے آگاہ رکھتے تھے۔ 1970ء میں انہوں نے مشرقی پاکستان کے حالات پر محترمہ بینظیر کو ایک طویل خط لکھا۔ جو اس وقت ہاورڈ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھیں۔ بعد میں یہی خط انکی کتاب ''عظیم المیہ'' (THE GREAT TRAGEDY) کی بنیاد بنا۔ جو آج تاریخ کی امانت ہے۔ اسی طرح ضیاء دور میں وہ میر مرتضیٰ کو سیاسی اور خاندانی حالات پر ہدایات دیتے رہتے تھے۔ میر مرتضیٰ اس وقت انکی ہدایت ہی کے مطابق ملک سے باہر تھے اور لنڈن میں SAVE BHUTTO COMMITTEE کے ذریعے بھٹو صاحب کی رہائی کیلئے بین الاقوامی مہم چلا رہے تھے۔ ایسے ہی ایک خط میں انہوں نے میر مرتضیٰ کو تحریر کیا تھا۔ ''میرے بعد تم میری قبا پہنو گے۔'' اس تمام تربیت کا مقصد یہ تھا کہ ان کے بچوں کو انکے دوستوں کی رفاقتوں کا اندازہ رہے اور ان کمین گاہوں سے آگاہی ہو۔ جہاں سے نشتر برسیں گے۔

اسکے بعد بھٹو صاحب اور بیگم صاحبہ مین ہاؤس چلے گئے۔ بھٹو صاحب نے مین ہاؤس سے منسلک لان کی تمام بتیاں روشن کرنے کا کہا اور فیملی کے ساتھ بیٹھ کر کافی نوش کی۔ 1975ء کے بنگلہ دیش کے واقعہ کے بعد جب وہاں وزیراعظم اور تمام اہل خاندان کو نشانہ بنایا گیا۔ بھٹو صاحب نہیں چاہتے تھے کہ مزاحمت یا کسی اور عذر کی بنیاد پر ضیاء ٹولے کو یہ موقع دیا جائے۔

اس دوران بھٹو صاحب کو مشورہ دیا گیا۔ کہ وہ وزیراعظم ہاؤس سے چلے جائیں یا فرار (کیونکہ وہاں ایسے انتظامات موجود تھے) لیکن بھٹو صاحب نے اس پر عمل کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ کیونکہ انہوں نے تاریخ کے ہاتھوں مرنے کے بجائے، ایک غاصب ڈکٹیٹر کے ہاتھوں مرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

(ماہنامہ ''صدائے جمہور'' اپریل 2010ء)

احمد رضا قصوری کے باپ کے قتل کی حقیقت

راؤ رشید

محمد احمد قتل کے صحیح واقعات تو یہ تھے جو میں نے اپنے بیان حلفی میں اس کا پورا ذکر کیا ہے کہ بھٹو صاحب ملتان دورے پر گئے ہوتے تھے میں بھی ملتان میں تھا تو رات کو کوئی بارہ ایک بجے میں سویا ہوا تھا ٹیلی فون بجا میں ہمیشہ ٹیلی فون ساتھ ہی رکھتا ہوں۔ ڈی آئی جی وکیل خاں نے مجھے کہا کہ رضا قصوری کی کار پر فائرنگ ہوئی ہے اس کے باپ کو گولی لگی ہے اور وہ مر گیا ہے اور یہ کہ ہم اس کو کہہ رہے ہیں کیس رجسٹر کراؤ۔ وہ کہہ رہا کہ میں تو کیس رجسٹر نہیں کراتا اس لئے کہ مجھے انصاف کی کوئی توقع نہیں ہے وہ کہتا ہے کہ گورنمنٹ کا اس میں ہاتھ ہے ظاہر ہے کہ مجھے کیس رجسٹر کرانے کا کیا فائدہ؟ میں نے وکیل خاں سے کہا اس کو کہو کہ جو ایف آئی آر وہ دے گا اس کا حق بنتا ہے ہم اس کو رجسٹر کریں گے اور اس کی تفتیش کریں گے کوشش ہماری یہی ہوگی کہ ایمانداری سے انویسٹی گیٹ کریں اس کو آپ کہیں کہ جو ایف آئی آر وہ دینا چاہتا ہے وہ دے چنانچہ اس نے ایف آئی آر دی جس میں بھٹو صاحب کا نام آیا اگر کوئی سازش ہوتی بھٹو صاحب نے کی ہوتی تو کیا ہم احمد رضا قصوری کو یہ کہتے کہ جو ایف آئی آر چاہو دے دو۔ اگر دل میں ہمارے چور ہوتا تو ہم یہ نہ کہتے کہ جو ایف آئی آر وہ چاہے دیدے۔ چنانچہ اس نے بھٹو صاحب کا نام دیا۔ ہم نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس لئے کہ قانونی طور سے یہ اس کا حق تھا ورنہ یہ بھی ہم کر سکتے تھے اگر سازش ہوتی جیسے ہی ڈی آئی جی کو اطلاع ملی تھی یا ایس ایس پی کو اطلاع ملی تھی تو وہ صرف اتنا لکھتا کہ اس

طرح سے اطلاع ملی ہے کہ ایک احمد رضا قصوری کی کار پر فائرنگ ہوئی اور اس کا باپ مر گیا صرف اتنا سا کیس۔ صرف اتنی F.I.R کافی تھی۔

دوسری بات یہ کہ بھٹو صاحب کی ہدایت تھی کہ جو بھی اہم کیس ہوں ان کو بتائے جائیں۔ صبح میں نے ان کو کہا کہ اس طرح سے رضا قصوری کی کار پر فائرنگ ہوئی ہے اس کا باپ مر گیا تو بھٹو صاحب نے بڑے تعجب کا اظہار کیا۔ Who could have done that

یہ کس نے کیا ہوگا میں نے کہا ہم تفتیش کر رہے ہیں کوشش کریں گے پتہ کرنے کی اس کے بعد انہوں نے کبھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ اس کیس کا کیا ہوا اور کیا اس کی تفتیش ہوئی۔ پہلے تو مجھے خود پتہ نہیں تھا۔ بعد میں میں نے بھی ان کو یہ نہیں بتایا کہ ان کا نام ایف آئی آر میں ہے لیکن ان کو یہ پتہ چل گیا کہ ان کا نام ایف آئی آر میں ہے انہوں نے نہ کبھی غصے کا اظہار کیا۔ نہ اس بات پر کبھی پریشانی کا اظہار کیا نہ مجھے کچھ کہا اگر کوئی سازش ہوتی یا بھٹو صاحب کے دل میں کوئی چور ہوتا تو اس کا بھی علاج کرنے کی وہ کوئی کوشش کرتے۔

اس کے بعد پھر جب ان لوگوں نے تفتیش شروع کی۔ جو بندوق استعمال ہوئی اس کے کارتوس نہیں ملتے تھے اب جب رپورٹ آئی تو اس میں کہا گیا کہ اس بندوق سے تو کار پر فائر ہی نہیں ہوا۔ اب ان کو ہوش آئی کہ اس کا کیا کریں یہ تو ایک بہت بڑی شہادت ہے بھٹو صاحب کے حق میں۔ مولوی مشتاق، ایم انور کیس کے چلنے سے پہلے ہر قدم پر مشورہ کر کے تفتیشی افسران کو ہدایات دیتے تھے یعنی یہ اتنی بڑی سازش تھی کہ لوگوں نے اپنے ضمیر اپنا ایمان ہر چیز بیچ دی اور مولوی مشتاق کے ہی زیر ہدایت ساری تفتیش ہوئی اور وہی پھر بعد میں جج بھی ہوئے یہ سارے مل بیٹھ کے ڈسکس کرتے تھے۔

چنانچہ اس نے کہا کہ اس کا کیا جواب دوں تو میرے ماتحتوں کو جو پرانے تھے ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبل ان کو یہ کہا گیا کہ تم کہو کہ جو کارتوس تھے وہ ہمارا ڈی ایس پی، آئی جی کی کوٹھی لے گیا۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہاں کارتوس بدلے گئے ہیں لیکن اس بات سے تو معاملہ Cover-up نہیں ہو سکتا تھا۔ اپیل میں ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ شک کا فائدہ ہمیشہ ملزم کو جاتا ہے یہ پہلا کیس ہے جس میں ہر شک کا فائدہ گورنمنٹ کو گیا، ضیاء الحق کو گیا۔ یہ تو کوئی ثابت نہیں کر سکا کہ

کارتوس بدلے گئے، ثبوت مکمل ہونا چاہیے اس پر چیف جسٹس فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ یہ کارتوس بدل دیئے گئے ہوں اسی طرح یہ ہوا جس جگہ سے فائرنگ ہوئی کارتوس ملے تین جگہ سے اس پر چیف جسٹس انوار الحق اپنے فیصلے میں لکھتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ اس آدمی نے ایسے فائر کر کے ، پھر اس طرح کیا ہو تو پھر وہ کارتوس ادھر گر گئے ہوں ہوسکتا ہے۔ ہر کام ہوسکتا ہے۔ اس شک کا فائدہ بھٹو صاحب کے خلاف اور گورنمنٹ کے حق میں دے رہے ہیں لیکن جن واقعات کا ذاتی طور پر مجھے علم تھا میں آئی جی تھا میں کورٹ میں بتا سکتا تھا بتانا چاہتا تھا وہاں گواہیاں پیش ہو رہی ہیں۔ آئی جی نے یہ کہا اب آئی جی موجود ہے اسے کوئی نہیں پوچھتا آدمی اگر مر جائے اس کے متعلق تو آپ کورٹ میں کہہ سکتے ہیں کہ اس نے یہ کہا تھا لیکن جب آدمی موجود ہے اس کو تو بلا کے پوچھیں بھئی تم نے یہ کہا تھا یا تم نے یہ کیا تھا جن لوگوں کو انہوں نے دم دبا کے اپنے حق میں کر لیا۔ ان سب کو تو وہاں پیش کر دیا گیا۔ مگر میرے جیسے آدمی سے اس کو انہوں نے قید میں رکھا۔

افسوس کی بات ہے کہ جس آدمی کی دم پر پاؤں رکھا۔ اس نے جھوٹی سچی گواہی دینے سے گریز نہیں کیا۔ مسعود محمود، سعید احمد خاں، عبدالوکیل خاں، ہلاکو خاں بڑے بڑے جو اپنے آپ کو پھنے خان کہتے تھے۔ ہر آدمی نے وہاں آ کے اپنا ایمان بیچا۔ مجھے بھی بڑے بڑے لالچ دیئے گئے۔ یہی کہ سفیر بنا دیں گے آپکو نوکری کا کچھ نقصان نہیں پہنچے گا ہم وعدہ کرتے ہیں۔ بس بھٹو صاحب کے خلاف آپ شہادت دے دیں۔ جنرل عبدالرحمٰن کو میرے اوپر لگایا ہوا تھا اس لئے لگایا تھا کہ وہ بھی اپنے آپ کو راجپوت کہتے ہیں برادری کی بنیاد پر، پھر ایک دن میں نے ان سے کہا جرنیل صاحب آپ یہ جو ہر روز چھڑی ہلاتے ہوئے آ جاتے ہیں اور مجھ سے توقع رکھتے ہیں کہ میں اپنے ضمیر کے خلاف کوئی بات کروں گا۔ آپ مجھے پھانسی لگا دیں گے؟ زیادہ سے زیادہ یہی کریں گے ناں آپ مجھے پھانسی لگا دیں مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوگی میں نے اپنی زندگی بھرپور انداز سے گزاری ہے تو مجھے آپ ان چیزوں سے نہیں ڈرا سکتے۔ بڑی سخت کلامی ہوئی اس کے بعد پھر وہ نہیں آئے ورنہ یہ کہ کبھی کسی بریگیڈیئر کو ساتھ لیا ہوا کبھی چھڑی ہلاتے ہوئے آ جاتے ہیں کہ راؤ صاحب آپ ہماری یہ امداد کر دیں آپ ہماری وہ امداد کر دیں تو میں نے کہا آپ نے مجھے کیا سمجھا ہوا ہے میں کوئی دو ٹکے کا پیشہ ور گواہ ہوں۔ میں نے چالیس ہزار کی فورس کو کمانڈ کیا ہے وہ

لوگ مجھ سے توقع رکھتے ہیں کہ میں کسی کردار کا مظاہرہ کروں۔ آپ یہ چاہتے ہیں کہ پوری پولیس کا بیڑہ غرق کردوں۔ میں یہ ثابت کردوں کہ ان کے سربراہ ایسے بے ضمیر ہیں کہ جب ان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے جو چاہے ان سے کہلوالیا جائے۔ میں نے کہا کہ میں صرف راؤ رشید نہیں ہوں۔ میں سابقہ آئی جی ہوں پولیس کا وہ میرے جوان، میرے افسر مجھ سے توقع رکھتے ہیں کہ میں کسی کردار کا مظاہرہ کروں؟ آپ میری نوکری لے لیں گے مجھے پھانسی چڑھادیں گے مجھے قید کرلیں گے ان چیزوں کی کیا اہمیت ہے۔

جنرل عبدالرحمٰن نے پہلی میٹنگ میں ہی کہہ دیا کہ آپ کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ میں گارنٹی دیتا ہوں کہ آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا آپ کا پوری طرح سے ہم خیال رکھیں گے۔ آپ ہماری امداد کریں۔ مجھے تو پتہ تھا جس دن سے یہ آئے اس دن سے انہوں نے بھٹو صاحب کے خلاف کیس بنانا شروع کردیا تھا یہ جو کہتے ہیں کہ مری میں گالیاں دی تھیں تو اس سے ناراض ہوگیا یہ ساری بکواس ہے انہیں تو پہلے دن سے ہی یہ ٹاسک ملا تھا کہ بھٹو صاحب کو سیاسی طور سے اور جسمانی طور سے ختم کرنا ہے۔

''جب چار اور پانچ جولائی 1977ء کی درمیانی شب پاکستانی فوج نے ملک میں مارشل لاء نافذ کیا تو مجھے بھی مسٹر بھٹو کے ساتھ گرفتار کرکے مارشل لاء ضابطوں کے تحت قید میں ڈال دیا۔ تقریباً گیارہ ماہ حراست یا نظر بندی میں رکھا گیا۔ اس دوران بھٹو پر نواب محمد احمد خان قصوری کے قتل کا مقدمہ چلایا گیا اور بدنام زمانہ مسعود محمود سمیت دو وعدہ معاف گواہوں اور ایف ایس ایف کے چار دوسرے افسروں کے اعترافی بیانات کی روشنی میں لاہور ہائیکورٹ نے انہیں سزائے موت سنادی تھی۔

یہ قتل اس وقت ہوا تھا، جب میں آئی جی پولیس پنجاب تھا۔ قید کے دوران فوجی حکام نے مجھ پر دباؤ ڈالا کہ میں مقدمے کے سرکاری گواہ کے طور پر پیش ہوجاؤں اور استغاثہ کی تائید کروں۔ میں نے ایسا کرنے سے انکار کردیا تھا۔ اس کی بجائے میں نے مسٹر بھٹو سے کہا کہ میں استغاثہ کے دعوے کو غلط ثابت کرنے کے لیے ان کے دفاع میں گواہ کے طور پر پیش ہونے کو تیار ہوں۔ تاہم ایسا نہیں ہوا کیونکہ انہوں نے مقدمے کا بائیکاٹ کردیا تھا۔

چونکہ مجھے مسٹر بھٹو کو پھانسنے کے واسطے تیار کیے گئے جال کے لیے خطرہ تصور کیا جاتا تھا، اس لیے مجھے اس وقت تک قید رکھا گیا جب تک عدالت نے انہیں خطاوار قرار دے کر سزائے موت نہیں دے دی۔ آخر اپریل 1978ء میں مجھے رہا کر دیا گیا۔ مسٹر بھٹو نے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی، جس کے ساتھ میرا بیانِ حلفی منسلک تھا، جس نے استغاثے کے موقف کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔

راولپنڈی میں سپریم کورٹ میں مسٹر بھٹو کی پٹیشن کی سماعت سے پہلے میں لاہور گیا اور ایک دوست کے گھر ٹھہرا۔ وہاں ایک نوجوان مجھے ملنے آیا۔ وہ رانا افتخار کا چھوٹا بھائی تھا۔ رانا افتخار ایف ایس ایف کا ایک سب انسپکٹر تھا۔ وہ اس مقدمہ قتل کا ایک ملزم تھا اور اس نے ہائی کورٹ میں اعترافی بیان دیا تھا جس کی بنیاد پر اسے بھی دو دیگر ملزمان کے ہمراہ سزائے موت سنائی گئی تھی۔ نوجوان نے مجھے بتایا کہ اس کا بوڑھا باپ بھی اس کے ساتھ آیا ہے اور گھر کے باہر کھڑا ہے۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کس مقصد سے آیا ہے تو اس نے کہا کہ ان لوگوں کے ساتھ بڑا دھوکا ہوا ہے اور وہ میری مدد لینے آیا ہے۔

اس نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ اس کا بھائی ایف ایس ایف میں سب انسپکٹر تھا۔ مارشل لاء نافذ ہونے کے فوراً بعد اسے محمد احمد خان کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا، اس کے ساتھ ایف ایس ایف کے دیگر کئی افسروں کو بھی گرفتار کیا گیا تھا جن میں ڈائریکٹر جنرل اور ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل بھی شامل تھے۔ ایک دن اس کے بھائی اور دو دوسرے گرفتار سب انسپکٹروں کو مارشل لاء ہیڈ کوارٹر لے جایا گیا، جہاں انہیں جنرل چشتی کے سامنے پیش کیا گیا، جو اس زمانے میں سی ایم ایل اے کا چیف آف سٹاف تھا۔ اس نے انہیں کہا کہ وہ پاکستان کے دشمن بھٹو کو پھانسی دینا چاہتے ہیں۔ ڈی جی ایف ایس ایف اور اس کا ڈپٹی پہلے ہی اعتراف کر چکے ہیں کہ انہوں نے مسٹر بھٹو کے احکامات کے تحت نواب محمد احمد خان کو قتل کروایا تھا اور انہیں معافی دے دی گئی ہے۔ اگر وہ بھی مسٹر بھٹو کو پھانسی چڑھانے میں فوجی حکام کی مدد کرے گا تو اس کی جان بھی بچ جائے گی۔ اگر اس کا بھائی اور اس کے ساتھ دو دیگر گرفتار شدہ سب انسپکٹر بھی اعتراف کر لیں اور اس کہانی کی تائید کریں کہ انہوں نے مسٹر بھٹو کے حکم پر محمد احمد خان پر گولیاں چلائی تھیں تو انہیں معافی دے دی جائے

گی یا معمولی سزائیں دی جائیں گی، جنہیں آخرکار معاف کر دیا جائے گا۔ اگر وہ ان کے احکامات پر عمل کریں گے تو انہیں ایف ایس ایف ہی میں رہنے دیا جائے گا، ترقی اور اراضی دی جائے گی۔ اگر انہوں نے عمل نہیں کیا تو انہیں محمد احمد خان کے قتل کا ذمہ دار قرار دے کر پھانسی پر چڑھا دیا جائے گا۔ مولانا طفیل محمد نے جو کہ اس کے بھائی کے ساتھی ملزم سب انسپکٹر رانا ارشد کا ہمسایہ تھا، ضمانت دی۔

چونکہ یہ وعدہ پاکستانی فوج کا ایک جنرل کر رہا تھا اس لیے انہوں نے اس پر بھروسہ کر لیا، اس کے علاوہ مولانا طفیل نے بھی ضمانت دی تھی، جو کہ جنرل ضیا کا ماموں مشہور تھا۔ ان کے خاندان کو امید تھی کہ مقدمے کے اختتام پر اس کے بھائی کو رہا کر دیا جائے گا لیکن جب انہوں نے سنا کہ نہ صرف اسے رہا نہیں کیا گیا بلکہ مسٹر بھٹو کے ساتھ سزائے موت سنا دی گئی ہے تو وہ دم بخود رہ گئے۔ وہ رونے اور گڑگڑانے لگا کہ میں اس کے بھائی کی جان بچانے کے لیے کچھ کروں۔ مجھے اس بے چارے پر بڑا ترس آیا لیکن میں اس آخری مرحلے پر ان کے لیے کچھ بھی کرنے سے خود کو قاصر پا رہا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ اگلے دن آئے۔

میں نے اپنے ایک دو وکیل دوستوں سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ اگر دھوکے کا شکار بننے والے تمام لوگ سپریم کورٹ میں ایک حلفیہ بیان جمع کروا دیں تو انہیں رہائی مل سکتی ہے۔

میں نے نوجوان کو یہی ہدایت کی۔ اس نے پوچھا کیا میں اسے کسی اچھے وکیل سے ملوا سکتا ہوں؟ اس زمانے میں سپیشل برانچ کے افسر جیپ میں ہر وقت ہر جگہ میرا تعاقب کرتے رہتے تھے۔ میں ان سے بچ بچا کر رات کو دیر گئے اسے مشہور وکیل عابد حسن منٹو کے گھر لے گیا۔ وہ مقدمہ لینے پر راضی ہو گیا۔ اس نے اسے ایک سادہ پاور آف اٹارنی دیا اور کہا کہ وہ راولپنڈی جیل میں قید اپنے بھائی سے اس پر دستخط کروا لائے۔ جب وہ نوجوان جیل میں اپنے بھائی سے ملا، اس وقت تک مارشل لاء حکام کو سن گن مل چکی تھی۔ حکام بہت زیادہ چوکس تھے۔ انہوں نے نوجوان اور اس کے باپ کو پکڑ لیا اور انہیں زبانی کلامی ڈرایا بھی اور لالچ بھی دیا تاکہ وہ راہِ راست پر آ جائیں۔ جنرل چشتی نے پھر وعدہ کیا کہ وہ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا، لیکن سپریم کورٹ کا فیصلہ آ جانے کے بعد ہی ایسا ممکن ہے۔ وہ لالچ میں آ گئے۔ اس نوجوان کو ایف ایس ایف میں براہِ راست اے ایس آئی لگا دیا گیا اور اس کے باپ کا منہ بند کرنے کے لیے آدھا

مربع اراضی دے دی گئی۔

جب اگلے دن میں مسٹر بھٹو کی پٹیشن کی سماعت سننے کے لیے گیا تو میں نے باپ اور بیٹے کو کمرۂ عدالت میں وکلائے استغاثہ اعجاز حسین بٹالوی اور ایس اے رحمٰن کے ساتھ بیٹھے دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ انہیں خرید لیا گیا ہے۔

وقفے کے دوران کسی نے آ کر مجھے بتایا کہ پولیس میری کار کی نگرانی کر رہی ہے۔ میں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ سماعت ملتوی ہونے کے بعد میں باہر نکلا تو دیکھا کہ وردی پوش پولیس والوں سے بھری ایک اور جیپ میری کار کے نزدیک موجود ہے۔ جب میں اپنے گھر جا رہا تھا تو اس جیپ نے آگے آ کر میرا راستہ روک لیا۔ ایک افسر جیپ سے اترا اور مجھے سلیوٹ کرنے کے بعد ایک کاغذ نکالا۔ وہ تین ماہ کے لیے میری گرفتاری اور اٹک جیل میں قید رکھنے کا حکم نامہ تھا۔ یہ امر واضح تھا کہ وہ مجھے دور رکھنا چاہتے تھے تاکہ میں ان کے منصوبوں کو ناکام نہ بنا سکوں۔

(اقتباسات: ''جو میں نے دیکھا'' شائع کردہ جمہوری پبلیکیشنز)

بھٹو کے خلاف، انتخابات میں دھاندلی کی حقیقت

راؤ رشید

4 مارچ 77ء کو لاہور میں میٹنگ تھی وہاں جیلانی ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی بھی موجود تھے۔ شیخ اکرم بھی تھا مسعود محمود بھی تھا میں بھی تھا پنجاب کے چیف سیکرٹری وغیرہ بھی تھے وہاں یہ بحث تھی کہ کتنی سیٹیں ملیں گی سرکاری افسروں نے وہی اندازہ بتانا شروع کر دیا ساہیوال کی شاید آٹھ سیٹیں تھیں سرکاری افسروں نے کہا کہ جی چار سیٹیں آپ کو ملیں گی لاہور کی آٹھ تھیں اس میں کہا کہ تین تو یقینی طور سے ملیں گی۔ ایک شاید اور مل جائے وہاں ڈاکٹر مبشر حسن بیٹھے ہوئے تھے ڈاکٹر مبشر جو بات کرتے ہیں بڑے دھڑلے سے کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ یہ کیا باتیں کر رہے ہیں بھٹو صاحب یہ آپ کو بالکل غلط بتا رہے ہیں یہ آپ کو گمراہ کر رہے ہیں ہم لاہور میں آٹھ سیٹیں جیتیں گے اور ساہیوال میں بھی شاید ایک سیٹ ہاریں۔

ڈاکٹر مبشر دھاندلی میں کبھی شریک نہیں تھے اگر ہوتی تو بھی شریک نہیں ہوتے، ان کے شریک ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس لئے صادق قریشی جہاں چیف منسٹر ہو وہاں ڈاکٹر مبشر تو معاملات کو نہیں چلا سکتے تھے اس لئے میں کہتا ہوں کہ اگر بھٹو صاحب سرکاری مشینری کو اس قسم کے اندازے بنانے کے لئے استعمال نہ کرتے تو یہ ان کے لئے کہیں بہتر ہوتا میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جو سیاسی ذہن ہے وہ سرکاری ذہن سے بڑا مختلف ہے۔ ڈاکٹر مبشر کا ذہن سیاسی ذہن تھا ہم لوگوں کا سرکاری ذہن تھا میرا خیال ہے کہ سب سے بڑی غلطی بھٹو صاحب سے یہ ہوئی کہ

انہوں نے اپنے سیاستدانوں کے ذہن کی بجائے نوکر شاہی کے ذہن پر انحصار کیا جس سے کہ وہ دھوکہ کھا گئے۔

اگر دھاندلی ہوئی تو منسٹروں نے دھاندلی کی اگر کہیں یہ کوئی پلان تھا، یہ بالکل غلط بات ہے۔ مجھے یاد ہے ہماری میٹنگ میں بھٹو صاحب نے کہا تھا کہ اگر کسی کو یہ خیال ہے کہ میں دو تہائی اکثریت چاہتا ہوں تو مجھے دو تہائی اکثریت کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے کوئی بڑی آئینی تبدیلی نہیں کرنی۔ اس لئے مارچ کی چار تاریخ کو کمشنروں کو میٹنگ میں بھٹو صاحب نے کہا تھا میں نہیں چاہتا کہ کوئی دھاندلی ہو، کمشنروں نے فوج کے سامنے بیان دیا تھا۔ کہ ہماری میٹنگ میں بھٹو صاحب نے کہا تھا کہ دھاندلی نہیں ہونی چاہیے۔ پھر دھاندلی کی پلاننگ کا خاکہ کہاں سے آیا۔ لاڑکانہ پلان کہاں سے آیا۔

بھٹو صاحب اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے ایک کاغذ پر دستخط کئے جس میں ایک پلان کا ذکر تھا۔ لیکن وہ پلان ان کی نہیں تھی چونکہ میں ان کی لینگوئج (زبان) سے واقف ہوں۔ مجھے ان کی زبان کا پتہ ہے جو بھٹو صاحب کی زبان کو جانتا ہے' وہ سمجھ سکتا ہے کہ وہ پلان ان کی لکھی ہوئی نہیں تھی مجھے شبہ یہ ہے کہ وہ بھی خالد احمد کی لکھی ہوئی ہے۔

مجھے شبہ ہے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا اس لئے کہ اس قسم کی فضول سی بات ایک سرکاری ذہن ہی کر سکتا ہے۔ ایک سیاستدان نہیں کر سکتا، اگر کوئی لاڑکانہ پلان ہوتی میں تو الیکشن سیل کا انچارج تھا، الیکشن کا سب سے زیادہ کام بھٹو صاحب نے میرے سپرد کیا ہوا تھا۔ تو کم از کم مجھے اس پلان کا پتہ ہوتا سب سے پہلی دفعہ مجھے اس پلان کا پتہ چلا جب میں نظر بند تھا ایک بریگیڈیئر اور ایک ڈی آئی جی صاحب میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھے پلان دکھائی کہ یہ کبھی تمہاری نظر سے گزری ہے۔ میں نے کہا میں نے اس کو پہلے کبھی نہیں دیکھا چنانچہ فوج نے ان کے خلاف سارا کیس لاڑکانہ پلان پر بنایا کہ یہ ان کی پلان تھی لیکن اس پلان میں جو باتیں تھیں ان میں سے کسی ایک پر بھی عمل نہیں ہوا' نہ کسی ڈسٹرکٹ میں کوئی ٹرانسپورٹ کمیٹی بنی، نہ کسی ڈسٹرکٹ میں ہر روز میٹنگیں ہوتی تھیں مطلب یہ ہے کہ صرف بھٹو صاحب کا اس پلان پر دستخط کر دینا کافی نہیں ہے۔ دیکھنا تو یہ تھا کہ اگر پلان ہوتا تو اس کا سب سے پہلے مجھے پتہ ہوتا' میں ہدایات بھیجتا

www.bhutto.org

کہ اس کے مطابق کام کیا جائے گا میں پھر دیکھتا کہ اس پر عمل ہو رہا ہے کہ نہیں ہو رہا نہ معلوم وہ پلان کس نے بنایا بھٹو صاحب نے کن حالات میں دستخط کئے اور کیا اس کی وجوہ تھیں لیکن یہ کہ وہ پلان میں نے کبھی اس الیکشن کے دوران میں کسی ڈسکشن میں کسی میٹنگ میں ڈسکس ہوتے ہوئے نہیں دیکھا نہ اس کی کسی بات پر عمل ہوا۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب میں پشاور میں تھا وہاں کے امریکن قونصلر کا نام Velletri (ویلیٹری) تھا۔ وہ سی آئی اے کا آپریٹر تھا۔ اور بہت ہی تیز آدمی تھا چلتا پرزہ تھا۔ اس علاقے کے سب سیاسی لیڈروں سے اس کی بڑی دوستی تھی۔ میرے ساتھ بھی اس نے اچھے خاصے مراسم پیدا کر لئے تھے۔ ایک دفعہ شام کو وہ میرے پاس آیا کہنے لگا کہ اب جا کے میں نے اطمینان کا سانس لیا ہے، میں نے پوچھا کیا بات ہے کہنے لگا' اصغر خان کا بھائی تھا۔ افضل خاں، اس کو اس ملک سے نکال کے کابل پہنچانا تھا۔

جی ہاں۔ میں نے کہا کیوں؟ تو اس نے بتایا'' وہ یہاں سے چھپ کے نکلنا چاہتا تھا تو میری ڈیوٹی لگی کہ میں اسے کسی طرح سے کابل پہنچاؤں۔ میں نے اس کا بندوبست کیا اور اب مجھے ٹیلی فون آیا کے وہ کابل پہنچ گیا ہے'' اس سے مجھے خیال آیا کہ اس قسم کا کوئی رشتہ تھا تو اس کو کابل پہنچایا اور پھر امریکہ پہنچایا اور وہاں اس کو سیٹل کیا، اس کے فرض منصبی میں شامل تھا۔ دوسرا یہ کہ جب میں پرائم منسٹر ہاؤس میں گیا تو وہاں جو انٹیلی جنس رپورٹیں آئی تھیں ان میں میں نے دیکھا کہ مشیر پیش امام کی تحریک استقلال کے سیکرٹری جنرل کو خاص طور پر امریکنوں سے ملاقاتیں ہوتی ہیں خصوصاً الیکشن سے پہلے اور پھر جب تحریک چلی۔ یہ مزید بات سامنے آئی کہ مشیر پیش امام کی کافی ملاقاتیں رہتی ہیں اور ویسے بھی مشیر پیش امام باہر چند ایک ملکوں میں انتخابات سے بالکل پہلے گئے بھی تھے۔ اس لئے یہ خیال تھا کہ امریکہ سے الیکشن کے سلسلے میں صلاح مشورہ کرنے گئے ہیں۔

اس کے علاوہ جو ایک بات مجھے مولانا احترام الحق تھانوی نے بتائی جس سے اس کی تصدیق ہوئی کہ اصغر خان ایک طرح سے امریکیوں کا مہرہ تھا اور وہ چاہتے تھے کہ اگر کسی نہ کسی شکل میں جمہوریت بحال ہو تو اس کو آگے لایا جائے۔

(اقتباسات: ''جو میں نے دیکھا'' شائع کردہ جمہوری پبلیکیشنز)

www.bhutto.org

امریکی مداخلت اور بھٹو کا مقدمہ

بریگیڈیئر سید احمد ارشاد ترمذی

''جن دنوں پاکستان سپریم کورٹ میں نواب محمد احمد خان کے قتل کے الزام میں لاہور ہائی کورٹ سے دی جانے والی سزائے موت کے خلاف ذوالفقار علی بھٹو کی اپیل پر بحث ہو رہی تھی، ہمارے ایک ''دوست'' نے جسے یو ایس آئی ایس کے ٹیلکس روم تک رسائی حاصل تھی مجھے Most urgent کا خصوصی کوڈ ڈ پیغام بھجوایا۔ پیغام کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے میں فوری طور پر طے شدہ مقام پر پہنچا۔

راولپنڈی کے راجہ بازار میں پرانے کپڑے فروخت کرنے والوں کی ایک ''فٹ پاتھ برانڈ'' مارکیٹ تھی جہاں اس وقت گاہکوں کا ہجوم تھا۔ میں نے دوست سے آنکھوں ہی آنکھوں میں گفتگو کی، اس نے ایک کاغذ ریڑھی پر رکھے ہوئے ایک کوٹ کی جیب میں ڈال دیا۔ میں نے فوری طور پر وہ کوٹ خرید لیا اور وہ پرچہ لے کر ایک قریبی فوٹو کاپی شاپ پر پہنچا اور فوٹو کاپی کروا کر اصل پرچہ اسی انداز میں ایک دوسری ریڑھی پر پڑے ایک کوٹ کی وساطت سے اسے واپس کر دیا۔ میں فوری طور پر دفتر واپس آیا تاکہ اس پیغام کا متن صحیح طور رسے پرکھا جا سکے۔ میں نے راستے میں بھی اس پیغام کو پڑھنے کی کوشش کی مگر صرف اتنا جان سکا کہ یہ واشنگٹن سے بھیجا ہوا ایک ٹیلی گرافک پیغام ہے۔ دفتر آ کر جب میں نے اس پیغام کو ڈی کوڈ کیا تو مجھے یہ پڑھ کر شدید حیرت ہوئی کہ واشنگٹن سے پاکستان میں اپنے دفتر کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ بھٹو کا پھانسی کے تختے تک پہنچنا یقینی بنایا جائے۔ اس پیغام میں بعض جنرل آفیسرز کی ریٹائرمنٹ اور تبادلوں کے بارے

میں بھی ہدایات موجود تھیں۔

میرے لیے یہ پیغام انتہائی غم و غصے کا باعث تھا۔ یہ پاکستان کے اندرونی معاملات میں ایک طرح کی کھلی مداخلت کے مترادف تھا۔ ہمارے پاس بھٹو کیس میں امریکی مداخلت اور امریکہ کے ملوث ہونے کے اور بھی کئی ثبوت موجود تھے مگر یہ پیغام بین الاقوامی سفارتی آداب کی خلاف ورزی کی انتہا تھی۔ امریکہ نے اپنے طور پر اس وقت بھٹو کی موت کا پروانہ جاری کر دیا تھا، جبکہ ابھی ان کا کیس پاکستان کی اعلیٰ ترین عدالت میں حتمی فیصلے کا منتظر تھا۔ پہلے بھی ہمارے پاس اس بات کے ثبوت تھے کہ بھٹو کے وکلاء لاہور کے فلیٹیز ہوٹل کے ایک کمرے میں بھٹو کے دفاع کے لیے جو پوائنٹس تیار کرتے تھے ان کی کاپی اگلے روز عدالت شروع ہونے سے پہلے سرکاری وکیل کے پاس پہنچ جاتی تھی۔

بہرحال دفتر پہنچتے ہی میں سیدھا ڈائریکٹر جنرل انٹیلی جنس جنرل ریاض کے پاس گیا اور انہیں وہ پیغام دکھایا۔ انہوں نے اس پیغام کو بار بار پڑھا، ان کا خیال تھا کہ یہ پیغام خود ساختہ اور مقامی طور پر تیار کیا ہوا ہے تاکہ ہمیں غلط راستے پر لگایا جا سکے۔ تاہم یہ فیصلہ کرنا جنرل صاحب کے لیے بھی مشکل تھا کہ اس طرح کے پیغام سے کسی مقامی ادارے یا شخص کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ بہرحال خاصی گفتگو کے بعد ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم پیغام اڑانے والے دوست سے اس کی صداقت کی مزید گواہی طلب کریں۔ میں نے رات گئے اسے بلوالیا۔ اور جنرل صاحب صبح کی سفیدی نمودار ہونے تک اس سے سوالات کرتے رہے۔ پیغام بالکل درست تھا اور اسے خود ساختہ قرار دینا ہمارے دوست کی ''دیرینہ دوستی'' کو الزام دینے کے مترادف تھا۔ اس کے باوجود یہ کاغذ کا ٹکڑا ہمارے لیے ابھی تک ایک معمہ تھا۔ جنرل ریاض نے فیصلہ کیا کہ ہمیں کسی سپیشلسٹ سے رجوع کرنا چاہیے۔ چنانچہ ہم دوسری صبح ہی اسے لے کر جنرل جیلانی کے پاس پہنچے جو اس وقت سیکرٹری جنرل ڈیفنس تھے۔ انہوں نے اسے بغور دیکھا اور کہنے لگے ''آئی ایس آئی والوں کو انتہائی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ غیر ملکی طاقتیں ہمارے معاملات میں غیر معمولی دلچسپی لے رہی ہیں۔'' جنرل جیلانی کے یہ الفاظ ہمارے ذہنوں کی وہ گرہیں نہ کھول سکے جنہیں لے کر ہم ان کے پاس گئے تھے۔

وہاں سے واپسی پر جنرل ریاض نے کہا کہ ہمیں اس کی قانونی حیثیت پر رائے حاصل

کرنی چاہیے۔ مسٹر جسٹس شمیم حسین قادری ان دنوں لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے۔ ان کے ساتھ ہمارے پرانے مراسم تھے۔ اور مجھے ان کی ذہانت اور پیشہ ورانہ صلاحیت پر پورا بھروسہ تھا۔ میں اگلی فلائیٹ پر لاہور گیا اور انہیں یہ پیغام دکھایا۔ وہ بھی یہ فیصلہ تو نہ کر پائے کہ یہ پیغام درست ہے یا خود ساختہ تاہم انہوں نے ان الفاظ میں اس معاملے پر اپنی رائے کا اظہار کیا:

''قانونی طور پر ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی نہیں دی جا سکتی۔ اولاً اس لیے کہ وہ اس مبینہ قتل میں براہ راست ملوث نہیں ہیں۔ ثانیاً اگر ہوئی تو بھی موت کی سزا متفقہ نہیں ہوگی۔ ججوں کی آراء میں واضح اختلاف لگتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ عدالت عظمیٰ کے جج بھی متفقہ فیصلہ نہیں دیں گے۔''

چیف جسٹس کے یہ الفاظ پیغام کی صحت کے بارے میں مجھے قائل کرنے کے لیے کافی تھے اور مجھے یقین ہو گیا تھا کہ بھٹو کو ضرور پھانسی دے دی جائے گی۔ اگر بھٹو قانونی طور پر موت کی سزا کے حقدار ہوتے تو اس پیغام کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ یہ پیغام بلاشبہ بھٹو کے عدالتی قتل کا حکم نامہ تھا۔ ہم نے اس پیغام کی کاپی صدر ضیاء کو بھجوا دی۔ ایوان صدر میں اس کا کیا ردعمل ہوا اس بات کا ہمیں علم نہیں۔ بہرحال ظاہری طور سے سب قانونی تقاضے پورے کرنے کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا اور یوں امریکہ کے سر سے یہ ''بلا'' ٹل گئی۔

(اقتباسات ''حساس ادارے'' شائع کردہ فکشن ہاؤس)

تاریخ سے پردہ اٹھتا ہے

چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین، امیر جماعت اسلامی مولانا طفیل محمد وکیل استغاثہ کے دفتر میں

(انٹرویو)

فرخ سہیل گوئندی: جناب فاروق بیدار صاحب پاکستان کے نامور اور سینئر وکیل ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو شہید کا لاہور ہائی کورٹ میں جسٹس مولوی مشتاق کی عدالت میں ٹرائل ہو رہا تھا۔ ایم انور بار ایٹ لاء اس کیس کا سپیشل پبلک پراسیکیوٹر تھا۔ اس کیس کے حوالے سے فاروق بیدار صاحب ان حقائق کو بیان کریں گے جو ابھی تک منظر عام پر نہیں آئے۔

فاروق بیدار 1966ء کو میں نے بطور وکیل ایم انور بار ایٹ لاء کو بطور اپرنٹس جوائن کیا۔ وہ میرے ساتھ بڑی مہربانی کے ساتھ پیش آتے رہے۔ جب بھٹو صاحب کا ٹرائل شروع ہوا تو انہوں نے کہا کہ تم میری ٹیم میں شامل ہو جاؤ۔ اس ٹیم کے سربراہ تو خود ایم انور بار ایٹ لاء تھے ان کے ساتھ اعجاز بٹالوی اور ایم اے رحمٰن تھے۔ میں نے معذرت کی اور کہا کہ میں پیپلز پارٹی کا فاؤنڈر ممبر ہوں۔ میں کیسے ذوالفقار علی بھٹو صاحب کے خلاف پیش ہو سکتا ہوں۔ انہوں نے کہا

You will get a handsome amount

ایک دن میں ان کے دفتر گیا تو اپنے کمرے سے ان کے کمرے میں جانے لگا تو مجھے منشی نے روک دیا کہ اس وقت آپ انور صاحب کے کمرے میں نہیں جا سکتے۔ مجھے تعجب ہوا کہ روکا کیوں جا رہا ہے۔ میں نے منشی سے دریافت کیا کہ مجھے بھی روکا گیا ہے۔ جی ہاں آپ کو بھی منشی نے کہا خاص مہمان آئے ہیں اور میں انتظار کرنے لگا۔

دس پندرہ منٹ کے بعد اس وقت کے جماعت اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد باہر نکلے اور کار میں بیٹھ کر چلے گئے۔ میں نے سوچا کہ خاص مہمان چلے گئے ہیں لہٰذا میں انور صاحب کے کمرے میں جاتا ہوں۔ منشی نے پھر مجھے کہا کہ ایک اور مہمان بھی ہیں۔ دس پندرہ منٹ کے بعد وہ مہمان بھی نکلے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ دوسرے مہمان اس وقت کے چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ مولوی مشتاق حسین تھے۔ جو اس وقت بھٹو کا ٹرائل کر رہے تھے۔

میرے لئے حیرانی کی بات تھی کہ جو جج بھٹو کا ٹرائل کر رہا ہے وہ سپیشل پبلک پراسیکیوٹر کے آفس سے نکل رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ایم انور صاحب نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے تمہیں اس لئے اندر نہیں بلایا کہ جیل سے اطلاع آئی تھی کہ بھٹو کے خلاف جو چار اعترافی ملزمان میاں محمد عباس، غلام مصطفیٰ، ارشد اقبال اور رانا افتخار ہیں وہ اب اپنا Confession واپس لے رہے ہیں اور اگر وہ بیان واپس لے لیں تو کیس ختم ہو جاتا ہے۔ ان میں سے دو جماعت اسلامی کے آدمی تھے۔ میاں طفیل محمد کو بلا کر یہ کہا گیا ہے کہ ان کو سزا تو ہو گی لیکن عمل نہیں ہو گا۔ اس لئے آپ جیل میں جا کر ان کو یقین دلائیں کہ آپ کو سزا تو ہو گی لیکن پھانسی نہیں ہو گی۔ جسٹس مولوی مشتاق صاحب نے بھی ان کو یقین دلایا ہے کہ ٹیلی فون پر جنرل ضیاء الحق کی ان سے بات کروائی گئی ہے۔ ضیاء الحق نے یہ کہا ہے کہ عدالت کی طرف سے ان کو جو سزا ہو گی۔ میں اس پر عمل درآمد نہیں کروں گا۔

ان کے جانے کے بعد میں اور ایم انور چائے پینے لگے، چائے کے دوران گفتگو جاری رہی۔ دو گھنٹے کے بعد فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فون اٹھایا اور پوچھا کون، تو جواب ملا میں طفیل ہوں..... اس وقت میرے ذہن میں میاں طفیل محمد نہیں آئے۔ میں نے سوچا کہ ان کا کوئی Client ہو گا۔ انور صاحب نے کہا..... جی..... اس کے بعد فون کرنے والے نے نہ جانے کیا کہا..... انور صاحب نے کہا Thank you.well done.I am releaved

اس کے بعد انور صاحب نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ اب یہ ہوا کہ جسٹس مولوی مشتاق حسین نے ان چاروں کو سزائے موت کا حکم سنا دیا۔

بھٹو کی سزا کے خلاف بین الاقوامی طور پر بھی اتنا پریشر تھا کہ اس کے باوجود ضیاء الحق نے ان کی سزا برقرار رکھی اور عمل درآمد بھی ہوا۔ ضیاء الحق نے بعد میں سوچا کہ اگر میں ان چاروں کی سزا معاف کر دیتا ہوں جنہوں نے براہ راست گولی چلائی تو پھر مجھ پر بہت زیادہ تنقید ہوگی۔ لہٰذا وعدے کے باوجود ضیاء الحق نے ان چاروں کی سزا بھی برقرار رکھی اور بالآخر ان کو بھی پھانسی ہو گئی۔ جب ان چاروں کے جنازے گھر آئے تو سننے میں آیا۔ ان لوگوں کے والدین اور لواحقین میاں طفیل محمد کو کوستے رہے کہ یقین دہانی کے باوجود وہ ہماری اولاد کو بچا نہیں سکے۔

(ماہنامہ ''صدائے جمہور'' اپریل 2010ء)

ذوالفقار علی بھٹو خوشگوار موڈ میں

www.bhutto.org

لاہور۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۶۹ء کوٹ لکھپت میں مزدوروں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے مسٹر بھٹو کے ہمراہ
احمد رضا قصوری کھڑے ہیں اور پیچھے دو نوجوان پارٹی کا جھنڈا لئے تشریف فرما ہیں

ذوالفقار علی بھٹو، شیخ محمد رشید اور معراج خالد کی یادگار تصویر

www.bhutto.org

سوویت راہنما برژنیف اور ذوالفقار علی بھٹو

www.bhutto.org

چیئرمین ماؤزے تنگ اور چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو۔ مئی 1974ء

www.bhutto.org

ذوالفقار علی بھٹو۔ جنرل ضیاء الحق

ہنری کسنجر اور ذوالفقار علی بھٹو

www.bhutto.org

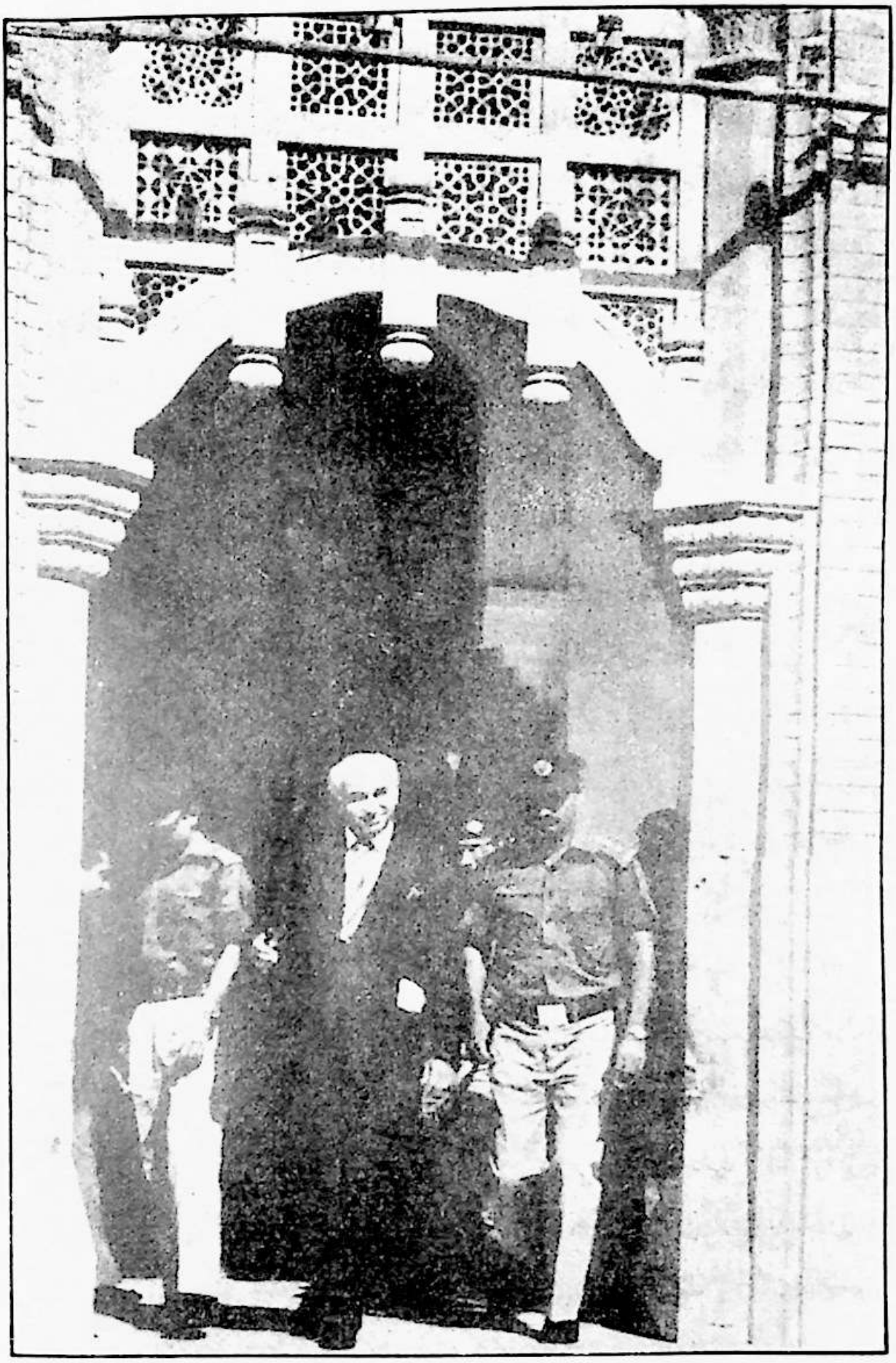

لاہور ہائی کورٹ میں دورانِ مقدمہ پولیس کی حراست میں ذوالفقار علی بھٹو

www.bhutto.org

تعصب اور سازش

جسٹس مولوی مشتاق حسین، جسٹس انوار الحق اور جنرل ضیاء الحق

میاں محمد ارشد سابق سیشن جج

مارشل لاء کیسے لگا

اپوزیشن نے دوبارہ الیکشن کروانے کے متعلق مذاکرات تو شروع کر دیئے لیکن اندرون خانہ فوج کو مارشل لا لگانے پر اکساتے رہے کیونکہ انہیں یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ دوبارہ الیکشن کرانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ بھٹو کا ووٹ بینک اتنا تھا کہ وہ ہر صورت دوبارہ آسانی سے کامیاب ہو جاتا۔ زیادہ سے زیادہ دو چار سیٹوں کا فرق پڑتا۔ ایسی صورت میں کوشش صرف مارشل لا کیلئے کی جاتی رہی۔ دوسروں نے صرف زبانی کوشش کی، ائیر مارشل اصغر خان نے تو تحریری طور پر فوج کو بلایا۔ مذاکرات میں دوبارہ الیکشن کا سمجھوتہ ہو گیا۔ لیکن اندرون خانہ اپوزیشن مارشل لا ہی چاہتی تھی۔ جیسے بعد میں پتہ چلا جنرل ضیاء الحق جو چیف آف آرمی سٹاف تھے اُن سے اپوزیشن کا رابطہ تھا لیکن وہ خوف زدہ تھا۔ بھٹو اور اُس کے ساتھیوں کو کچھ شک پڑا لہٰذا مارشل لا سے ایک روز قبل یعنی 4 جولائی 1977ء کو شام کو کیبنٹ میٹنگ ہوئی اور ضیاء الحق کو تبدیل کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔ اس وقت ڈیفنس سیکرٹری غلام اسحاق خان تھے اُن کو حکم دیا گیا کہ فوراً آرڈر جاری کر دیئے جائیں۔ اُس وقت رات کے 10-11 بجے تھے۔ ڈیفنس سیکرٹری نے کہا کہ دیر زیادہ ہو گئی ہے۔ کل صبح صبح آرڈر جاری ہو جائیں گے۔ بھٹو یا اُس کے کسی وزیر کو یہ علم نہ تھا کہ اندرون خانہ وہ اپوزیشن سے ملا ہوا ہے اور اُس کا رابطہ جنرل ضیاء الحق سے ہے۔ لہٰذا کیبنٹ میٹنگ صبح کے انتظار میں ختم ہو گئی۔ غلام

www.bhutto.org

اسحاق خاں نے فوراً ضیاء الحق سے رابطہ کیا اور کہا کہ Now or never اسی رات کارروائی کرلو ورنہ صبح کو تم تبدیل کر دیئے جاؤ گے۔ چنانچہ ضیاء الحق نے مناسب انتظام کر کے صبح 3-4 بجے اسلام آباد پر قبضہ کرلیا۔ بھٹو اور تمام متعلقہ وزرا یا پارٹی لیڈروں کو نظر بند کر دیا گیا۔

مبینہ دھاندلی کی حقیقت

مارشل لا کے بعد دیگر اقدامات اور احکامات کے علاوہ جس معاملہ میں میرا عمل دخل ہوا وہ یہ تھا کہ مارشل لا والوں نے ایک ٹریبونل بنایا جس کے روبرو اُن مرکزی یا صوبائی سمبلیوں کے ممبران جن کے خلاف دھاندلی کی شکایات تھیں۔ مقدمے تیار کر کے پیش کرنا تھے تا کہ انہیں سزا دی جا سکے اور مستقبل کیلئے نااہل قرار دے دیا جائے۔ پنجاب میں مارشل لا ہیڈ کوارٹر اسمبلی بلڈنگ میں قائم کیا گیا تھا۔ وہاں ایک سیل اس کام کیلئے قائم کیا گیا جس میں ایک فوجی کرنل اور کچھ پولیس افسران لگائے گئے۔ متعلقہ پولیس کو شکایات کی تفتیش اور ثبوت اکٹھا کرنے کیلئے کہا گیا۔ سب سے پہلا جو کیس تیار ہوا اُس کو ٹریبونل میں بھجوانے کیلئے مقدمہ لوکل مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی Approval کیلئے پیش کیا گیا وہاں کسی نے مشورہ دیا کہ کیونکہ عدالتی معاملہ ہے اس لیے مقدمہ محکمہ قانون کو دکھا کر پھر دائر کیا جائے جب یہ احکام سیکرٹری قانون کے پاس آئے تو انہوں نے وہ کیس میرے سپرد کیا کہ میں قانونی رائے تیار کروں۔ میں نے سوچا کہ یہ نازک معاملہ ہے اس لیے مجھے اکیلے کو Opinion نہیں دینی چاہیے۔ میں نے سیکرٹری کو مشورہ دیا کہ جناب ایسے معاملات کیلئے ایک کمیٹی بنا دی جائے تا کہ تین آدمی اکٹھے کیس دیکھیں اور مشورہ دیں۔ وہ مشترکہ فیصلہ ہوگا یہ پتہ نہیں چلے گا کہ کس نے کیا رائے دی ہے۔ سیکرٹری قانون کو یہ تجویز پسند آئی چنانچہ انہوں نے MLA سے بات کی اور ایک کمیٹی بنا دی جس کا سربراہ مجھے بنایا گیا اور میرے ساتھ ایک کرنل اور ایک ایس پی کو کمیٹی کے ممبران بنا دیا گیا۔ چنانچہ ہم نے کیس پر غور وخوض کیا اور ایک مشترکہ فیصلہ لکھا کہ کمیٹی کی کیا رائے ہے۔ اس طرح ایک ایک کر کے مقدمات پر رائے دی اور استغاثہ کی Voting بھی کر دی۔

ہمارے پاس شروع میں جو 5-7 کیس آئے اُن میں اکثریت ایسی تھی جس میں تفتیش نامکمل یا

ثبوت کافی نہ تھا لہٰذا ان کو مزید تفتیش یا ثبوت کیلئے واپس کیا اور واضح کیا کہ کسی چیز کی مزید تفتیش یا کس قسم کا مزید ثبوت درکار ہے۔ اس طرح سے مقدمات کی رفتار بہت سست رہی اور صرف چند ایک مقدمات ہی شروع میں دائر ہو سکے۔ اس دوران میں ہم نے دیکھا کہ اکثر شکایات Wild قسم کی تھیں جن کا کوئی تسلی بخش ثبوت نہ تھا۔ اُن کو ہم واپس کرتے رہے۔ تقریباً ایک سال یہ کام چلتا رہا۔ اس دوران میں یہ نتیجہ ہم نے نکالا کہ دھاندلی بڑے پیمانے پر بالکل نہیں ہوئی۔ صرف 5-7 سیٹوں میں ہوئی اور وہ بھی ہر سیٹ کے چند ایک پولنگ سٹیشنوں میں اور اگر الزامات کو درست تسلیم بھی کر لیا جائے اور وہاں کے سارے ووٹ مخالف فریق کو بھی دے دیئے جائیں تب بھی نتیجہ Upset نہ ہو سکتا تھا۔ بہر کیف جو کیس ہم نے ٹربیونل کو بھجوائے اُن میں تقریباً سب میں سزا ہوئی اور ملزم کو مستقبل کیلئے نااہل قرار دے دیا گیا۔ کچھ کیس ہم نے پاس بھی کر دیئے لیکن مارشل لا اتھارٹیز نے سیاسی وجوہ پر ٹربیونل میں دائر ہی نہ کیے۔ مثال کے طور پر مولانا کوثر نیازی کے خلاف الزامات کی فہرست سب سے زیادہ طویل تھی اور اُس میں کچھ ایسے تھے کہ مقدمہ کامیاب ہو جاتا لیکن بوجوہ مقدمہ دائر ہی نہ کیا گیا کیونکہ مولانا کوثر نیازی مارشل لا والوں کے ساتھ شامل ہو گیا تھا اور غالباً بھٹو کے خلاف راز بتانے کا وعدہ کرتا تھا بہر کیف جو واقعات ذاتی علم کی بنیاد پر میں نے بتائے ہیں اُس سے صاف ظاہر ہے کہ بھٹو کے خلاف تحریک بالکل بلا جواز تھی اور ایک امریکی سازش تھی۔

جسٹس مشتاق کی دشمنی اور عناد

جسٹس مشتاق کو بھٹو کے خلاف بہت سخت عناد تھا۔ اس کی کئی ایک وجوہات تھیں۔ لہٰذا وہ بھٹو سے بہت سی باتوں کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ ایک بات یہ تھی کہ جب بھٹو نے سردار اقبال کو لاہور ہائی کورٹ کا چیف جسٹس بنایا تو مولوی صاحب کو سخت ناراضگی ہوئی۔ کیونکہ اُن دونوں نے ایک ہی دن ہائی کورٹ کے جج کا حلف اٹھایا تھا لیکن سردار اقبال سینئر قرار دیئے جا چکے تھے لہٰذا نہ صرف سینئر ہونے کے اُن کا حق تھا بلکہ قابلیت اور دیگر کوالٹیز کی وجہ سے اُن کو صحیح طور پر چیف جسٹس بنایا گیا تھا۔ مولوی مشتاق نے کچھ ایسا رویہ اختیار کیا کہ کچھ ایسی نامناسب حرکات کیں جس پر بھٹو نے اُس کی سرزنش کی۔ بھٹو نے مولوی مشتاق کو سپریم کورٹ بھیجنا چاہا بلکہ ایک دفعہ ایسا کرنے کا بھی حکم

www.bhutto.org

کر دیا جس پر مولوی مشتاق نے بھٹو سے ملکر منت سماجت کی اور کہا کہ اُن کی خواہش ہے کہ خواہ ایک دن کیلئے ہو وہ چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ ضرور لگنا چاہتے ہیں۔ بھٹو نے مولوی مشتاق کی بے عزتی تو خوب کی لیکن اُس کے اصرار پر احکامات واپس لے لیے مولوی مشتاق اپنی بے عزتی کو کبھی بھلا نہ سکا۔

ستمبر 1976ء میں بھٹو نے بہت نامناسب اور غیر ضروری وجہ سے آئین میں پانچویں ترمیم کر دی جس کی وجہ سے ہائی کورٹ کے دو چیف جسٹس جو اس عہدہ پر چار سال مکمل کر چکے تھے اُنہیں Choice دی گئی کہ وہ اگر چاہیں تو انہیں سپریم کورٹ بھجوایا جائے اور اگر ہائی کورٹ میں رہنا چاہیں تو نمبر 2 یعنی سینئر پونی جج کے طور پر کام کریں۔ ورنہ وہ ریٹائرمنٹ لے لیں۔ سردار اقبال صاحب نے دیگر آپشنز قبول نہ کیں اور ریٹائرمنٹ لے لی۔ اُن کی ریٹائرمنٹ پر مسٹر یحییٰ بختیار کے مشورے پر جسٹس اسلم ریاض کو نویں پوزیشن سے اٹھا کر لاہور ہائی کورٹ کا چیف جسٹس بنا دیا۔ اس پر مولوی مشتاق آگ بگولا ہو گئے انہوں نے اسلم ریاض کے تحت کام کرنے سے انکار کر دیا اور چھٹی لیکر انگلینڈ چلے گئے۔ وہ برملا کہتے تھے کہ انہیں کبھی موقعہ ملا تو وہ بھٹو کے ساتھ وہ کچھ کریں گے جو بھٹو ہمیشہ یاد رکھے گا۔

جنرل ضیاء الحق کی منافقت

میری نظر میں ضیاء الحق ایک بہت بڑا منافق شخص تھا۔ میری اُس سے دو تین مرتبہ ملاقات ہوئی جس کا ذکر میں نیچے کروں گا وہ اپنے آپ کو پیش تو اس طرح کرتا تھا جیسے وہ انتہائی ایماندار منصف مزاج اور جائز کام کرنے والا حکمران ہے۔ لیکن اُس نے بے شمار ایسے کام کیے جس میں مفاد پرستی بھی تھی۔ بدنیتی اور پرلے درجہ کی منافقت بھی ہوتی تھی۔ جنرل ضیاء الحق نے جب مارشل لاء لگایا تو اعلان کیا کہ وہ تین ماہ کے اندر اندر نئے الیکشن کروا کر حکومت منتخب نمائندوں کو دے کر واپس چلا جائے گا۔ یہ سب جھوٹا اور بدنیتی پر مبنی وعدہ تھا تا کہ فوری طور پر پیپلز پارٹی کوئی ایجی ٹیشن نہ کرے اور نئے الیکشن تک انتظار کرے۔ اس طرح آہستہ آہستہ جوں جوں اُس کی حکومت جڑیں پکڑتی گئی الیکشن کی تاریخ ملتوی ہوتی رہی اس کی اقتدار چھوڑنے کی نیت شروع سے ہی نہیں تھی۔ اس

طریقہ کار کی Support اُسے بھٹو مخالف سیاسی پارٹیوں نے خاص طور پر مذہبی جماعتوں نے دی کیونکہ وہ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ دوبارہ الیکشن میں پیپلز پارٹی کامیاب ہو جائے۔ لہٰذا اُن پارٹیوں میں سے اور خاص طور پر مذہبی پارٹیوں مثلاً جماعت اسلامی میں سے کچھ لیڈر جنرل ضیاء الحق کی حکومت میں شامل ہو گئے جنرل ضیاء الحق نے نظام اسلام کو نافذ کرنے کا نعرہ لگایا اور اس کو بنیاد بنا کر حکومت جاری رکھی اور تین ماہ کی بجائے گیارہ سال گزار دیئے اگر وہ ہوائی جہاز کے حادثے میں نہ مارا جاتا تو معلوم نہیں کب تک وہ حکومت سے چمٹا رہتا۔ جنرل ضیاء الحق نے بھٹو کے معاملے میں جو کچھ کیا وہ میں ذکر کر چکا ہوں کہ کس طرح مفاد پرست لوگوں سے سازش کر کے اُس نے بھٹو کو پھانسی لگوایا۔ اس کے علاوہ اُس خود اپنی فیملی اور تعلق والوں کو بے شمار فائدے دلائے۔ مثلاً F-7 اسلام آباد میں چھ سات کوٹھیاں اپنی اور اپنی فیملی ممبران کیلئے بنوائیں۔ ہر چھاؤنی میں پلاٹ لیے۔ اپنے لڑکے اعجاز الحق کو بغیر کسی استحقاق اور متعلقہ کوالیفکیشن کے ایک بینک جو غالباً BCCI تھا نیروبی (مشرقی افریقہ) میں منیجر لگوایا۔ پانچ ہزار ڈالر تنخواہ کے علاوہ تقریباً اتنی ہی رقم کے دیگر لوازمات دلوائے۔ اپنے ایک بھانجے میاں جہانگیر پرویز کو ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج لگوایا۔ حالانکہ اُس نے کوئی متعلقہ امتحان پاس کیا تھا اور نہ ہی پبلک سروس کمیشن کے ذریعے آیا تھا۔ ضیاء الحق کا بہنوئی جو جہانگیر پرویز کا والد تھا اور وزیر آباد میں رہتا تھا۔ اُس کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی کہ وہ لوگوں سے پیسے لے کر اُن کے کام کروائے۔ اپنے بھائی کو اسلام آباد میں میڈیکل اور الیکٹرانک سٹور کھلوا کر دیا۔ بہرکیف ہر قسم کی کنبہ پروری کی۔ دوستوں اور بعض ملنے والوں کے بھی کئی غلط اور ناجائز کام کرواتا تھا۔ ایک جرنلسٹ مسٹر حمید احمد سیٹھی نے اپنے ایک مضمون ''سرخ فیتہ'' میں لکھا کہ جنرل ضیاء الحق نے ایک کرپٹ اشٹام فروش کو بحال کروایا۔ وہ واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ ''مجھے آج بھی ساہیوال کا وہ دن یاد ہے جب صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق نے ایک کرپٹ اشٹام فروش کی بحالی کیلئے دو ٹیلیفون اور ایک آرڈر جاری کیا تھا اس اشٹام فروش نے ایک مرحوم مالدار شخص کے نام کا اشٹام اس کی زندگی کی تاریخ میں اس کے ایک رشتہ دار کو تیار کر دیا تھا جس پر اس رشتہ دار نے متوفی کی پراپرٹی اپنے نام کروانے کی کوشش کی۔ اس پر رولہ پڑ گیا اور شکایت ڈپٹی کمشنر تک پہنچ گئی۔ ڈپٹی کمشنر نے تا تکمیل انکوائری اشٹام فروش کا لائسنس معطل

کر دیا۔ پٹواری کی طرح اشٹام فروش بھی کوئی معمولی چیز نہ تھا۔ دوسرے ہی دن ڈپٹی کمشنر کو صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق کا ٹیلی فون آ گیا انہوں نے نہایت محبت اور نرمی سے خیر خیریت پوچھی اور اس کے بعد انہوں نے سائلوں والے لہجے میں اشٹام فروش کا لائسنس بحال کرنے کی سفارش کی۔ سفارش کا اثر الٹا ہو گیا۔ ڈپٹی کمشنر نے دوسرے دن اظہار وجوہ کا نوٹس جاری کر دیا اس نوٹس میں فوجداری کارروائی کا اشارہ بھی شامل تھا۔ اس دن صدر کا دوسرا ٹیلی فون گیا لیکن اس بار لہجہ درشت تھا۔ ڈپٹی کمشنر نے جواباً عرض کیا سر معاملہ سنگین اور بظاہر Proved ہے لہٰذا وہ انکوائری مکمل ہونے پر ہی اشٹام فروش کا لائسنس بحال کرنے کی بابت رائے دے سکے گا۔ انکوائری کا تو خدا جانے کیا بنا لیکن ڈپٹی کمشنر خالد محمود کا تبادلہ وہاں سے With immediate effect ہو گیا تھا۔ یہ بھی ایک ایماندار بااصول ڈپٹی کمشنر تھے جنہوں نے اصول بچانے کیلئے صدر تک کا حکم تسلیم نہ کیا۔''

مجھے بھی ذاتی طور پر ایک ایسے واقعہ کا علم ہے۔ جس میں اُس نے اپنے بہنوئی وزیر آباد والے کو فائدہ پہنچایا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک میرے دوست وکیل چودھری رفیق احمد (مرحوم) لاہور میں پریکٹس کرتے تھے۔ اُس سے پہلے وہ رحیم یار خاں میں وکالت کرتے تھے اور وہیں میری اُن سے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ 79-1978ء کی بات ہے جب میں محکمہ قانون پنجاب میں ایڈیشنل سیکرٹری تھا۔ ایک شام میں اپنے گھر یعنی مکان نمبر 405 پاک بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور میں موجود تھا کہ چودھری رفیق احمد اپنے ایک کلائنٹ جوان کا دوست بھی تھا۔ جس کا نام اکبر علی تھا اور وہ لنک میکلوڈ روڈ لاہور میں ٹی وی اور الیکٹرانک سامان وغیرہ امپورٹ کرنے کا کاروبار کرتا تھا اور ایک K.E کالج کے ہوسٹل والی سڑک پر ایک ٹی وی وغیرہ مرمت کرنے کی دکان بھی ملازمین رکھ کر چلا رہا تھا۔ اُس کو لیکر میرے پاس آیا۔ مجھے بتایا کہ اُس اکبر علی کے ایک بھائی محمد اشرف کو ایک قتل کیس میں پھانسی کی سزا ہو چکی ہے۔ اپیل بھی خارج ہو چکی ہے اور اب صدر صاحب کو رحم کی اپیل دینی ہے۔ میں چونکہ محکمہ قانون میں تھا وہ مجھ سے رحم کی اپیل بنوانا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں رحم کی اپیل تو تیار کر دی لیکن ساتھ ہی مشورہ یہ دیا کہ صدر صاحب کے بہنوئی وزیر آباد میں ہیں اُس کو کچھ دے دلا کر کام کروایا جائے ورنہ اپیل کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ اُس تک پہنچنے کیلئے بھی کوئی ریفرنس چاہیے۔ میں نے انہیں بتایا کہ اُس کا لڑکا جہانگیر پرویز جو ایڈیشنل سیشن جج قصور

ہے وہ اپنے باپ تک لے جا سکتا ہے۔ میاں جہانگیر پرویز تک پہنچنے کیلئے میں نے اپنے دوست چودھری محمد نسیم جو قصور میں سیشن جج تھے اُن کے نام رقعہ دے دیا۔ چنانچہ وہ میاں جہانگیر پرویز تک پہنچ گئے اور اُن کے ساتھ اُن کے والد کو وزیر آباد میں جا ملے۔ پچاس ہزار روپے طے ہوئے اُس میں سے 25 ہزار دیکر وہ انہیں لیکر صدر صاحب کے پاس پنڈی گئے۔ اکبر علی کوٹھی کے باہر کھڑا رہا۔ وہ مل کر باہر آئے اور کہا کہ فی الحال صدر صاحب نے ایک ماہ کیلئے سٹے آرڈر دے دیا ہے کیونکہ سب پھانسیوں کے خلاف رحم کی اپیلیں روک رکھی ہیں اور اُن میں فائنل آرڈر اس لیے نہیں کرتے کہ اُس وقت بھٹو کی رحم کی اپیل اُس کے پاس Pending ہے اور جب تک بھٹو کو پھانسی نہ لگ جائے وہ کسی رحم کی اپیل کو منظور کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ عارضی حکم بھی غنیمت تھا۔ لہٰذا واپس آ کر بھٹو کی پھانسی کا انتظار کرنے لگے۔ بھٹو کی پھانسی کے تیسرے روز اکبر علی پھر بقیہ 25 ہزار روپے دے کر جہانگیر پرویز کے والد کو لے کر صدر صاحب کے پاس گئے تو انہوں نے پھانسی عمر قید میں تبدیل کر دی۔

(اقتباسات ''مبالغہ نہ مغالطہ'' تاریخ اشاعت 2006ء
میاں محمد ارشد سابق سیشن جج سیکرٹری قانون پنجاب اور مشیرِ قانون وفاقی محتسب)

پھانسی گھاٹ کا گواہ

جیل سپرنٹنڈنٹ یار محمد دریانا

مرحوم ریٹائرڈ چوہدری یار محمد دریانا، ڈی آئی جی جیل خانہ جات جو کہ ذوالفقار علی بھٹو کی قید اور پھانسی کے وقت راولپنڈی ڈسٹرکٹ جیل کے سپرنٹنڈنٹ تھے اور قیدی نمبر 425 ان کی تحویل میں تھا۔ قیدی نمبر 425 ذوالفقار علی بھٹو 323 دن تک ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی میں رہے اور وہ قانونی اور اخلاقی طور انہی کی ذمہ داری میں تھے۔ آج ہم چوہدری صاحب سے وہ واقعات جو تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں۔ ان سے پوچھتے ہیں۔ چوہدری یار محمد دریانا صاحب کا یہ میڈیا میں پہلا انٹرویو ہے۔ اس سے قبل انہوں نے کسی پرنٹ یا الیکٹرانک میڈیا کو کوئی انٹرویو نہیں دیا۔ ہم یہ اہم انٹرویو اپنے قارئین کی نذر کر رہے ہیں۔

سوال: چوہدری صاحب ذوالفقار علی بھٹو جب 323 دن تک قید رہے تو آپ سپرنٹنڈنٹ جیل تھے، آپ ان سے کتنا عرصہ پہلے پنڈی جیل میں تعینات رہے؟ کیا آپ نے پہلے سوچا تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو آپ کے ماتحت آئیں گے؟

جواب: میں ذوالفقار علی بھٹو سے پہلے صرف ایک ماہ بطور سپرنٹنڈنٹ جیل یہاں آیا۔ میری اس سے پہلے سرگودھا میں پوسٹنگ تھی۔ وہاں سے اپریل 1987ء میں میری ٹرانسفر راولپنڈی کر دی گئی۔ اس سے آٹھ نو سال پہلے بھی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے یہاں سروس کر چکا تھا۔

www.bhutto.org

سوال: آپ کو کب اطلاع ملی تھی کہ ذوالفقار علی بھٹو کو آپ کی جیل میں لایا جا رہا ہے؟

جواب: مجھے کسی نے اطلاع نہیں دی تھی لیکن میری راولپنڈی میں تعیناتی کے بعد بھٹو صاحب کو راولپنڈی لایا گیا۔ ان کا کوٹ لکھ پت جیل میں ٹرائل ہو رہا تھا اور جب وہاں سے ان کی اپیل خارج ہو گئی تو انہیں سپریم کورٹ میں اپیل کے لیے یہاں منتقل کرنا تھا لیکن مجھے اس کا علم نہیں تھا میں اپنی ڈیوٹی حسب معمول انجام دے رہا تھا۔ میں دفتر میں بیٹھا تھا اور اس وقت مارشل لاء لگ چکا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ کچھ آرمی اور سول آفیسر گیٹ کے سامنے آئے ہیں۔ میں دفتر سے باہر آیا اور دیکھا کہ ڈی ایم ایل اے شاہ رفیع عالم، ایس ایم ایل اے راحت لطیف اور دوسرے سول افسران بھی تھے یہ سب صاحبان جیل کے اندر آ گئے اور جیل کا دورہ شروع کیا۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ یہ افسران جیل کا دورہ کرنے کیوں آئے۔ تاہم میرا قانونی کام تھا میں نے ان کا ساتھ دیا۔ ان لوگوں نے جیل کا ہر طرف دورہ کیا۔ پورے جیل کا چکر لگایا اور آخر کار وہ مین گیٹ کے سامنے بائیں طرف ہمارا خواتین کا ایک وارڈ تھا۔ وہ لوگ وہاں آ کر کھڑے ہو گئے اور آپس میں بات کی کہ "This is the right place" (یہ موزوں جگہ ہے) اس کے بعد بھی وہ جیل کا چکر لگاتے رہے لیکن انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور نہ مجھے کہا کہ یہ جگہ کس چیز کے لیے موزوں ہے اور وہ دورہ کر کے چلے گئے۔ بعد ازاں مجھے انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات جن کا ہیڈ آفس لاہور تھا۔ وہاں سے مجھے فون آیا ان کی طرف سے کہ بھٹو صاحب کو راولپنڈی منتقل کیا جا رہا ہے۔ ان کی اپیل سپریم کورٹ میں چلنے والی ہے جو جیل کا دورہ کرنے کے لیے مہمان آئے تھے وہ بھی اسی سلسلے میں آئے تھے وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ بھٹو صاحب کو رکھنے کے لیے کون سی محفوظ ترین جگہ ہے۔ لہٰذا مجھے بتایا گیا کہ ان کو زنانہ وارڈ میں رکھا جائے گا اور اس وارڈ میں وہ سکیورٹی اور حفاظتی امر کے پیش نظر کچھ تبدیلیاں کریں گے اور نئے سرے سے فرش بچھائیں گے۔ اس کے چھت کو نیا بنایا جائے گا اور مختلف کام کریں گے لہٰذا آپ ان کو یہ تمام کام کرنے دیں۔ اس وقت معلوم ہوا کہ بھٹو صاحب کو راولپنڈی ڈسٹرکٹ

جیل منتقل کیا جا رہا تھا۔

سوال: چوہدری صاحب! آپ گوجرانوالہ میں سپرنٹنڈنٹ جیل تھے تو آپ کو جب اطلاع ملی کہ ذوالفقار علی بھٹو لکھ پت جیل میں قید ہیں تو کیا آپ کے ذہن میں خیال آیا تھا کہ کاش وہ گوجرانوالہ ہوتے یا آپ کوٹ لکھ پت جیل میں تعینات ہوتے؟

جواب: یہ بعد کی بات ہے کہ میں لاہور کسی سرکاری کام کے سلسلے میں گیا تھا۔ وہاں سے پھر میں سینٹرل جیل کوٹ لکھ پت بھی گیا۔ میری یہ خواہش ہوئی کہ میں ذوالفقار علی بھٹو جیسے عالمی لیڈر سے ملوں جو ہمارے ملک کے وزیراعظم رہ چکے تھے۔ چونکہ ہماری جیلوں میں ہمیں مختلف مجرموں اور جرائم پیشہ ور لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے لیکن یہ پہلا واقعہ تھا کہ اتنی اہم شخصیت کو جیل جانا پڑا۔ لہٰذا مجھے انہیں دیکھنے کی بڑی خواہش ہوئی۔ کوٹ لکھ پت جیل کا جو انچارج تھا وہ میرا ساتھی رہا تھا۔ میں اس کے پاس گیا اور کہا کہ اگر ہو سکے تو بھٹو صاحب کی جگہ مجھے دکھا دیں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ جیل کے اندر کیسے رہ رہے ہیں اور اگر ممکن ہو سکے تو بھٹو صاحب سے ملوا بھی دیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ کا ملنا ان سے مناسب نہیں ہے لیکن میں وہ جگہ دکھا سکتا ہوں۔ اس طرح میں اس جگہ گیا جہاں بھٹو صاحب بند تھے۔ میں نے وہ جگہ باہر سے ہی دیکھی۔ وہ سیل نما ایک جگہ تھی۔ میں باہر سے ہی جگہ دیکھ کر چلا آیا۔ میرے اندر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ہمیشہ ان پڑھ، جاہل طبقے اور مجرمانہ قسم کے لوگوں سے ہمارا واسطہ پڑتا ہے تو اتنے Intellectual ذہن اور اعلیٰ پایہ شخص جیل میں ہے کاش! میری سروس ان کے ساتھ ہوتی یا میری پوسٹنگ ان کے ساتھ ہو جائے یا ان کو اس جیل میں منتقل کیا جائے جہاں میں ہوں تا کہ ان کے ساتھ ملنے جلنے کا موقع ملے گا اور ان کے حالات کا پتہ چلے گا۔ میری بڑی خواہش تھی ان کا رہنا سہنا کیسا تھا۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کا رہن سہن کیسے ہوتا ہے اور کیسے یہ لوگوں سے باتیں کرتے ہیں اور زندگی گزارنے کا ان کیا کیا طریق کار ہے لہٰذا میرے اندر بڑی خواہش پیدا ہوئی کاش کہ ہمیں اکٹھے رہنے کا موقع ملے۔

سوال: راولپنڈی آپ کا تبادلہ آپ کی خواہش پر ہوا، خود بخود ہوا یا یہ ایک منصوبہ بندی کا حصہ تھا؟

جواب: نہیں! یہ پلاننگ کا حصہ نہیں تھا۔ دراصل میں اس سے قبل پنڈی جیل میں آفیسر رہ چکا تھا۔ جب 1974ء میں میری ترقی ہوئی میں نے اس وقت بھی خواہش تھی کہ میری راولپنڈی میں ہی پوسٹنگ ہو جائے لیکن وہ نہ ہو سکی۔ بھٹو صاحب کے واقعہ سے پہلے یعنی 1977ء میں، میں نے پھر کوشش کی تھی کہ میری پوسٹنگ پنڈی جیل میں ہو جائے لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ ضلع گجرات تحصیل پھالیہ کے آخر پر ہمارا گاؤں ہے۔ سب سے نزدیک ہمیں سرگودھا شہر پڑتا ہے۔ پنڈی پوسٹنگ نہ ہونے کے بعد میں نے افسران کو کہا کہ میری پوسٹنگ پھر سرگودھا کی جائے وہ میرے گھر کے نزدیک ہے۔ وہاں میری پوسٹنگ میرے کہنے پر ہوئی۔ نومبر 1977ء کو سرگودھا میری پوسٹنگ ہوئی۔ اس کے بعد قریباً اپریل 1978ء میں روالپنڈی پوسٹنگ ہوئی تو مجھے آئی جی جیل خانہ جات نے ٹیلی فون کر کے کہا کہ تم نے پنڈی کے لیے سفارشیں کرائی تھیں تو ابھی وقت ہے اگر آپ جانا چاہتے ہیں تو جا سکتے ہیں کیونکہ پنڈی کا سپرنٹنڈنٹ جیل وہاں سے ٹرانسفر ہونا چاہتا ہے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ پنڈی کے سپرنٹنڈنٹ جیل کو معلوم ہو گیا تھا کہ بھٹو صاحب کو یہاں منتقل کیا جا رہا ہے لہٰذا وہ اس ذمہ داری سے بچنا چاہتا تھا تو اس نے کہیں اور پوسٹنگ کے لیے کہا۔ آئی جی نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ بھٹو صاحب کو پنڈی منتقل کیا جا رہا ہے اس لیے آپ پر مہربانی کر رہے ہیں لیکن صرف یہ کہا کہ آپ کی پنڈی پوسٹنگ کی خواہش تھی اب وقت آیا اگر آپ چاہیں تو آپ کو وہاں تعینات کیا جائے گا۔ میں نے ہاں جواب دیا۔ مجھے بھٹو صاحب کی پنڈی منتقلی کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ چنانچہ 16 یا 17 اپریل 1978ء کو میری پوسٹنگ راولپنڈی ہوئی۔

سوال: چوہدری صاحب! جیل کے تمام اختیارات، کسی کو ملاقات کروانا، کسی کو پھانسی دینا، کسی کو اطلاع دینا، ملاقات نہ کروانا۔ تمام آپ کی ذمہ داری ہے۔ جیل کے قواعد کے مطابق کسی اور شخص کو اس کا اختیار یا حق نہیں ہے کہ آپ کے صوابدیدی اختیارات میں

مداخلت کرے۔ تو ایک کرنل رینک کا آدمی بھی اس بات کا دعویدار ہے کہ وہ جیل کا انچارج تھا۔ یہ کیسے ہوا اور کب ہوا، یہ منصوبہ کہاں سے بنا اور احکامات کہاں سے آئے؟

جواب: دراصل میری راولپنڈی پوسٹنگ کے صرف ایک ماہ بعد ہی بھٹو صاحب کو یہاں منتقل کیا گیا۔ یہ لوگ جیل میں کام کرتے رہے۔ انہوں نے اس جگہ کو اپنے طریقے سے اپنے انداز میں بنایا۔ اس کے چھت اکھیڑے نئے لگائے، نیچے فرش کو نیا کیا اور دیگر صفائی کا کام کیا۔ ایک سیل میں بھٹو صاحب کے کچن کا بندوبست کیا، ایک سیل میں بیت الخلاء کا اور ایک سیل میں ان کے سامان کا بندوبست کیا۔ یہ وہ لوگ خود کرتے رہے۔ اس کے بعد ایس ایم ایل اے جنرل راحت نے مجھے دفتر بلا کر بتایا کہ بھٹو صاحب آج رات یا کل یہاں منتقل ہو رہے ہیں۔ اس کے لیے ہم سب شوپیس ہیں بنیادی طور پر اصل شو آپ کا ہے۔ ساری ذمہ داری آپ کی ہے۔ جیل کے اندرونی Arrangements سارے کے سارے آپ کے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہم نے ایک کرنل انچارج اور پوری بٹالین کو وہاں سکیورٹی کے پیش نظر تعینات کر دیا۔ جیل کی چھت پر جو کمرے بنے ہوئے ہیں انہیں خالی کروا دیں وہاں جوان رہیں گے۔ باقی جوان ساتھ پولیس لائن میں رہیں گے۔ یہ آپ کے بس کی بات نہیں کہ سارا انتظام آپ سنبھالیں کیونکہ بھٹو کوئی عام آدمی نہیں۔ بھٹو کو سزائے موت ہو چکی ہے لہٰذا سکیورٹی کے پیش نظر ہم آپ کے ساتھ فوج انیج کر رہے ہیں۔ میں پھر آپ کو بار بار کہہ رہا ہوں کہ اندرونی سکیورٹی Arrangements کے آپ ایسے ذمہ دار ہیں جیسے آپ وہاں دوسرے لوگوں کے لیے ذمہ دار ہیں۔ لہٰذا ان تمام معاملات کا میں ہی ذمہ دار تھا۔

سوال: ان معاملات کے آپ ہی ذمہ دار تھے لیکن کیا کرنل صاحب ان معاملات میں کوئی بے جا مداخلت بھی کرتے تھے، احکامات بھی دیتے تھے؟

جواب: دراصل انہوں نے ہمیں ایک باقاعدہ سکیورٹی پلان دیا۔ اس پلان میں انہوں نے

چابیوں تک کا بھی ذکر کیا تھا کہ چابیاں کس کس کے پاس رکھی جا سکتی ہیں۔ سپرنٹنڈنٹ جیل، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل اور کرنل رفیع۔ یہ تین آدمی چابیوں کو ہینڈل کریں گے۔ بلکہ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ دو افسر مل کر تالا کھولا کریں گے۔ ایک ہی گیٹ کے دو تالے تھے ایک کی چابی ان کے پاس تھی دوسری میرے پاس تھی۔ انہوں نے پلان بنایا تھا کہ کیا کیا ڈیوٹی ہے اور کیا کیا فرائض ہیں۔ سکیورٹی پلان کے تحت انہوں نے چھت کے اوپر گنیں بھی فٹ کی تھیں۔ وہاں پوری بٹالین تعینات تھی ان کا کام سکیورٹی کا تھا لیکن آہستہ آہستہ وقت گزرنے کے ساتھ کرنل رفیع اور دیگر نے اپنے افسران کو کہہ کر اور اندر دخل دینا شروع کیا لیکن پھر بھی جو حکم آتا تھا اس کی باقاعدہ ایک کاپی مجھے بطور انچارج سپرنٹنڈنٹ اور ایک انچارج سکیورٹی کے اسے دی جاتی، ہم کسی قسم کی ملاقات نہیں کروا سکتے تھے جب تک میرے پاس اور کرنل رفیع کے پاس بھی تحریری طور پر احکامات نہیں ہوتے تھے۔

سوال: چوہدری صاحب! ایک کرنل کا سپرنٹنڈنٹ جیل کے پاس کام کرنا، کیا اس کرنل صاحب کا جیل یا محکمہ جیل خانہ جات میں کوئی تبادلہ ہوا تھا، کوئی احکامات جاری ہوئے تھے، کیا اس کے جیل کے قواعد میں گنجائش ہے کہ کوئی آدمی باہر کسی سروس کا داخل کر دیا جائے؟

جواب: آپ کو پتہ ہے کہ مارشل لاء لگ چکا تھا یہ سارے احکامات مارشل لاء کے تحت ہو رہے تھے، صدر صاحب سے نیچے تک سب کو پتہ تھا کہ ان کے احکامات سے یہ سارا منصوبہ بنا تھا لیکن سول قوانین میں ایسا کوئی ضابطہ نہیں ہے۔ اگر جیل کے حالات غیر معمولی ہو جائیں تو اس صورت میں ہم پولیس وغیرہ سے مدد لے سکتے ہیں لیکن آرمی کی متواتر پوسٹنگ نہیں ہوتی۔ کبھی حالات بہت خراب ہوں تو چند دنوں کے لیے وہ آ کر مدد کرے اور حالات معمول پر لانے کے لیے آتے اور یونٹس میں واپس چلے جاتے ہیں۔ لیکن مکمل پوسٹنگ کرنا یہ کبھی بھی نہیں ہو سکتا۔

سوال: چوہدری صاحب! آپ نے کوٹ لکھپت جیل سے اس بات کی خواہش کا اظہار کیا کہ

www.bhutto.org

آپ بھٹو صاحب کا سیل دیکھنا چاہتے ہیں لیکن پھر 17 مئی 1978ء کو وہی سپرنٹنڈنٹ جیل صبح 5 بجے کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کو لے کر آپ کے پاس آتے ہیں۔ پھر آپ دونوں حضرات نے بھٹو صاحب کے پاس اکٹھے چائے بھی پی۔ اس وقت آپ کے کیا احساسات تھے اور گفتگو کیا ہوئی تھی آپ کے اور بھٹو صاحب کے درمیان؟

جواب: جب ہم بیٹھ گئے تو سپرنٹنڈنٹ جیل نے مجھے کہا کہ یہ تو قسمت کی بات ہے جو کچھ بھی بھٹو صاحب کے ساتھ ہو رہا ہے یا جو کیس چل رہا ہے لیکن جیل افسران کے ناتے جو جائز سلوک ہمارا ان کے ساتھ ہو سکتا ہے وہ ان سے کریں گے۔ نہ اس بیچارے کو کچھ پتہ تھا نہ مجھے پتہ تھا۔ جب بھٹو صاحب کوٹ لکھپت جیل میں تھے اتنی سختیاں اور پابندیاں نہیں تھیں۔ اس وقت کیس زیر سماعت تھا لیکن جب انہیں پنڈی لایا گیا تو بھٹو صاحب کا سٹیٹس بدل چکا تھا۔ انہیں سزائے موت سنائی جا چکی تھی۔ اس کے لیے قوانین بڑے سخت ہوتے ہیں۔ میں نے انہیں کہا کہ انشاءاللہ جو جائز ہوگا قوانین کے مطابق وہ ہم بھٹو صاحب کے ساتھ کریں گے۔

سوال: بھٹو صاحب کو اپنے پاس یا اپنے ماتحت یا اپنے اختیارات کے نیچے پا کر آپ نے کیا محسوس کیا، اس لمحہ آپ کے کیا احساسات تھے؟

جواب: قدرتی طور پر جب ایسے حالات ہوں تو کیا احساسات ہو سکتے ہیں! ایک آدمی (بھٹو صاحب) کہاں اور جیل سپرنٹنڈنٹ کہاں! پھر قدرتی طور پر بھٹو صاحب جیسے شخص میرے ماتحت بن گئے۔ یہاں بات سے بات نکلتی ہے۔ یہ بعد کی بات ہے بھٹو صاحب جب اپنے سیل کے صحن میں بیٹھتے تھے۔ انہیں ایک گھنٹے کی اجازت تھی صحن میں نکلنے کے لیے تو میں ان کے پاس گپ شپ لگانے کے لیے آتا تھا کیونکہ سپرنٹنڈنٹ جیل پر اس قسم کی کوئی پابندی نہیں ہوتی تھی۔ میں بھٹو صاحب کے پاس جاتا تھا تو بھٹو صاحب مجھے دیکھتے ہی اٹھنے کی کوشش کرتے تھے۔ جیسے تعظیماً کسی بڑے آدمی کے لیے اٹھا جاتا ہے۔ مجھے شرمندگی ہوتی تھی تو میں بھٹو صاحب کو کہتا تھا کہ مجھے شرمندہ نہ کریں اور آپ اس طرح میرے لیے اٹھنے کی کوشش نہ کیا کریں بھٹو صاحب

کہتے تھے:

''یار محمد، اللہ جس کو عزت دے اس کی عزت کرنی چاہیے۔ آپ کو پتہ ہے کہ You are the governor of this institution باہر ملکوں میں جیل سپرنٹنڈنٹ کو سپرنٹنڈنٹ نہیں بلکہ گورنر کہا جاتا ہے۔ لہٰذا آپ بھی گورنر ہیں۔ میری جو بھی پوزیشن تھی لیکن اب تو میں قیدی ہوں۔ اس لیے آپ کو تعظیم دینا۔ آپ کو Respect دینا میرے ضمیر کے مطابق ضروری ہے۔''

آپ نے جو سوال کیا کہ کیسا محسوس ہوتا تھا تو اس وقت مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ایک ایسا شخص جو ملک کا وزیراعظم بھی رہا ہے ایک قیدی کی حیثیت سے میرے ماتحت آ گیا۔

سوال: 17 مئی کو آپ کے بھٹو صاحب سے اچھے تعلقات تھے 18 مئی کو ذوالفقار علی بھٹو نے بھوک ہڑتال کر دی۔ بھوک ہڑتال کرنے کی وجوہات آپ کے علم میں ہیں۔ سکیورٹی گارڈ ان کے سر پر کھڑا تھا یا جو ان کا بیت الخلاء تھا اس پر ایک معمولی پردہ لگایا گیا تھا جس سے بے حرمتی ہوتی تھی آدمی نظر آتا تھا۔ اس قسم کی چیزیں آپ کے اختیار میں تھیں۔ کیا یہ آپ نے کیا تھا یا کسی اور نے کیا تھا؟

جواب: میں نے آپ کو بتایا کہ ان کے آنے سے پہلے فوجی جرنیلوں دیگر افسران نے جن میں میجر جنرل شاہ رفیع عالم ڈی ایم ایل تھے۔ بریگیڈیئر راحت لطیف ایس ایم ایل اے کرنل رفیع بھی شامل تھے۔ یہ جو بھی بندوبست تھا سکیورٹی کے حساب سے وہ ان لوگوں نے کیا تھا کیونکہ قیدی خودکشی نہ کر سکے۔ ہوسکتا ہے اگر بجلی کی تار سیل میں ہو تو کرنٹ اس میں موجود ہو تو اس کو کوئی بھی حادثہ پیش آ سکتا ہے۔ عام طور پر سزائے موت کے قیدی کے پاس بجلی نہیں ہوتی۔ ان کا بھی سکیورٹی پلان فوج نے مکمل کیا تھا۔ جیل انتظامیہ کا قطعاً اس میں کوئی عمل دخل نہیں تھا۔

سوال: بھٹو صاحب کے سیل میں آلات لگائے گئے تھے وہ ایک الگ ادارے نے لگائے تھے۔ کیا اس کے بارے میں آپ کو علم تھا؟

جواب: مجھے بتایا گیا تھا کہ وہاں کچھ آلات نصب کیے گئے تھے۔ لیکن میں انہیں منع کرنے کی

پوزیشن میں نہیں تھا۔ کیونکہ مجھے پہلے ہی آئی جی نے حکم دے رکھا تھا کہ یہ وہاں جو بھی تبدیلی کریں گے یا جو بھی اس عمارت کے ساتھ کریں آپ نے کوئی رکاوٹ نہیں ڈالنی۔

سوال: چوہدری صاحب! ذوالفقار علی بھٹو اس دوران سارا عرصہ آپ کے پاس رہے۔ اگر اس دوران کوئی فوج کے لوگ یا کوئی آدمی ان کو نکال کے لے جاتے تو اس کی ذمہ داری تو آپ پر عائد ہوتی تھی۔ آپ اگر دخل نہ دیتے تو قانوناً اور اخلاقاً آپ ملزم بن جاتے؟

جواب: میں زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا کہ میں نے آئی جی کو آلات کے بارے میں بتایا تو انہوں نے کہا کہ ہم Helpless ہیں اس بارے میں۔ یہ چیزیں جنرل ضیاء الحق تک کے نوٹس میں تھیں تو انہیں کرنے دیں ان لوگوں کو لیکن جہاں تک بھٹو صاحب کو نکال کر لے جانے والی بات تھی وہ تو ہم پر ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ ہم اکیلے کوئی فوجی اندر نہیں چھوڑتے تھے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ کوئی فوجی آئے اور لے جائے۔

سوال: بھٹو صاحب کو کیسے یہ علم ہوا کہ ان کے سیل میں آلات لگائے گئے۔ یہ آپ کے عملے نے بتایا یا آپ نے بتایا؟

جواب: سچی بات ہے! یہ تو میں نے ہی بتایا تھا کیونکہ بھٹو صاحب ضیاء الحق کو بہت گالیاں دیا کرتے تھے۔ میں نے ایک دن سوچا کہ شاید بھٹو صاحب کو معلوم نہیں ہے کہ یہاں جاسوسی کے آلات لگائے گئے ہیں۔ لہٰذا گالیاں دینے سے ضیاء الحق اور بھٹو صاحب کے حالات مزید کشیدہ ہو سکتے ہیں۔ میں یہ چاہتا تھا کہ کسی طریقے سے بھٹو صاحب کی جان بچ جائے۔ مجھے اندر سے بھٹو صاحب سے ہمدردی تھی کیونکہ میں سوچتا تھا کہ Intellectual آدمی ہے اور عالمی شہرت کا حامل انسان ہے تو اس کو اس طرح ضائع نہیں ہونا چاہیے۔ یہاں عام قاتل کا بھی مقتول کے ورثاء سے سمجھوتہ ہو جاتا ہے میں اس چیز کے پیش نظر چاہتا تھا کہ ان کا آپس میں کمپرومائز ہو جائے لیکن بھٹو صاحب جب کھلم کھلا ضیاء الحق کو گالیاں نکالتے تھے تو وہ آلات کی ریکارڈنگ میں آتی تھیں۔

اس لیے میں نے ایک دن بھٹو صاحب کو کان میں بتا دیا کہ آپ گالیاں نکالتے ہیں یہ اچھی بات نہیں ہے لہٰذا آپ مہربانی کر کے اپنے اوپر ضبط کریں کیونکہ یہاں حساس آلات نصب ہیں لہٰذا اس طرح کی باتیں کھل کر نہ کیا کریں۔

سوال: کیا کوئی صاحب ان کے پاس زمین پر لیٹ کر یا ہلکی آواز میں آ کر گفتگو کرتے تھے؟ کیا ایسا بھی کوئی واقعہ ہے؟

جواب: یہ بعد کی بات ہے بھٹو شروع سے بہت متنفر تھے۔ جب بھٹو صاحب باہر بیٹھے ہوئے تھے تو باہر تعینات فوجی نظر آتے تھے اور ان کی گنیں بھی نظر آتی تھیں۔ اس وقت بھٹو صاحب انہیں گالیاں نکالتے ہوئے کہتے تھے کہ میں تم نوے ہزار لوگوں کو اس لیے یہاں لایا تھا کہ تم میرے اور میری جان کے پیچھے ہی پڑ جاؤ۔ وہ ان فوجیوں کو بھی گالیاں دیتے تھے۔ کرنل رفیع کبھی بھٹو صاحب کے سامنے آنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ لیکن بعد میں مجھے بتایا گیا کہ بھٹو صاحب کی ملاقات کے بعد ایک دن کرنل رفیع ،بھٹو صاحب کی سیل کے سامنے کھڑا ہو گیا اور سلیوٹ مارا اور بھٹو صاحب کو کہا ''سر کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟'' تو بھٹو صاحب نے پوچھا ''تم کون ہو؟'' میرے خیال میں بھٹو صاحب نے خود ہی پوچھا Are you Col. Rafi تو اس نے کہا، جی سر! اس طرح آہستہ آہستہ کرنل رفیع نے اپنا اعتبار بنایا۔ مجھے نہیں پتہ کہ کرنل رفیع کا کیا مقصد تھا اور وہ بھٹو صاحب کے ساتھ کیا باتیں کرتا تھا۔ اس کو پتہ تھا کہ حساس آلات نصب ہیں اس لیے یہ لیٹ جاتا تھا اور بھٹو صاحب سے کان میں باتیں کرتا تھا اس کو پتہ تھا اگر وہ بیٹھ کر ان سے باتیں کرے تو وہ اوپر تک جا سکتی تھیں۔ کرنل رفیع واحد آدمی تھا جو بھٹو صاحب سے اس طریقے سے باتیں کرتا تھا۔

سوال: تو بھٹو صاحب بھی لیٹ کر ہی سنتے تھے؟

جواب: جی ہاں! وہ بھی لیٹ جاتے تھے۔

سوال: کیا اس بارے میں آپ نے فوجی حکام یا پولیس حکام کو مطلع کیا کہ اس طرح کرنل رفیع ،بھٹو صاحب کے ساتھ گفتگو کرتا ہے؟

جواب: جی ہاں! میں نے بتادیا تھا، بریگیڈیئر راحت کو بھی میں نے اس بارے میں بتادیا تھا کہ آپ کا سکیورٹی انچارج ایسے کرتا ہے۔ آپ نے خود بتایا کہ سارے انتظام کا ذمہ دار میں تھا اگر کوئی اٹھا کر بھٹو صاحب کو لے جاتا، یا کچھ بھی ہوتا تو ذمہ داری میری تھی۔ لہٰذا جب سکیورٹی انچارج ہی مل جائے تو اگر کوئی حادثہ ہو جائے تو گردن تو میری پکڑی جاتی۔ اس لیے میں نے حکام کو بتادیا کہ کرنل رفیع بھٹو صاحب سے چھپ چھپ کے باتیں کرتے ہیں۔

سوال: بھوک ہڑتال بھٹو صاحب نے 18 تاریخ کو شروع کی تھی؟

جواب: سچی بات ہے مجھے اچھی طرح یاد نہیں ہے۔ لیکن یہ مجھے یاد ہے کہ بھٹو صاحب کے وکلاء نے سپریم کورٹ میں شکایت کی تھی اور بتایا تھا کہ ان کے کلائنٹ کو جو سہولیات دی گئی تھیں وہ بھی چھین لی گئیں۔ وہ شکایت کرتے تھے کہ بھٹو صاحب کے پاس بیڈ نہیں ہے۔ وہ ہسپتال کا بیڈ ہے جس سے ان کے جسم پر خراشیں آئیں۔ وہ بھی بدل دیا جائے اور ان کے مطالبے پر سپریم کورٹ نے خط لکھا تھا کہ ان کے مطالبات تسلیم کر لیے جائیں۔ جو خط آیا تھا اس کی کاپی میں نے ہوم سیکرٹری اور ایس ایم ایل کو بھیجی تھی اور وہ چیزیں ہم نے ان کو فراہم کیں۔

سوال: وہ لوگ سادہ لباس میں گئے ہوں گے جب انہوں نے وہاں Changing کی؟

جواب: جی وہ سول کپڑوں میں فوجی تھے۔

سوال: چوہدری صاحب کچھ ہی عرصہ بعد بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو بھی نظر بند کر دیا گیا اور انہیں سہالہ ریسٹ ہاؤس میں رکھا گیا اور جو نظر بندی کے احکامات تھے ان کے مطابق وہ بھی آپ کے ہی ماتحت تھے؟

جواب: جی! دراصل جب کسی قیدی کو کسی دوسری جگہ پر رکھا جاتا ہے تو اس جگہ کو سب جیل قرار دیا جاتا ہے۔ وہ سب جیل کسی نہ کسی کے ماتحت ہوتی ہے لہٰذا وہ سب جیل بھی میرے ماتحت تھی۔

سوال: آپ کے کوئی آدمی وہاں پر تعینات تھے؟

جواب: جی ہاں! اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جیل اور چند سپاہی وہاں تعینات تھے اور وہ اس جیل کے اندر تعینات کیے گئے تھے۔ وہ ان کا کھانا وغیرہ بھی پکاتے تھے۔ باقی باہر پولیس تعینات تھی۔

سوال: سزائے موت کا قیدی ہو یا عام قیدی ہو۔ اس سے بیک وقت بیس بیس تیس تیس یا پندرہ آدمی ملاقات کرتے ہیں۔ بھٹو صاحب کے ساتھ ایسا نہیں تھا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اور نصرت بھٹو کو پھانسی سے قبل کبھی یکجا ملاقات کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس کے احکامات کس کی طرف سے تھے اور کیا یہ احکامات جیل قوانین کے مطابق تھے؟

جواب: جیل قوانین کے مطابق اس وقت بھی گھر کے 18 فرد ملزم سے ملاقات کے لیے آ سکتے تھے اور انہیں ملاقات کی اجازت دی جا سکتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی جیل سپرنٹنڈنٹ کی یہ صوابدید ہوتی تھی کہ وہ اس سے زیادہ لوگوں کی ملاقات بھی کروا سکتا تھا لیکن بھٹو صاحب کے بارے میں جو بھی معاملات تھے سپریم کورٹ کے جج صاحبان کا کہنا تھا کہ ان معاملات کے بارے میں جیل سپرنٹنڈنٹ سے رابطہ کریں۔ یعنی بھٹو صاحب کو کئی قسم کی تکالیف جو ہوتی تھیں تو ججز سپرنٹنڈنٹ جیل سے رابطہ کرنے کو کہتے تھے لیکن بھٹو صاحب کے وکلاء نے کئی بار یہ کہا کہ جیل سپرنٹنڈنٹ وہاں نام کا سپرنٹنڈنٹ ہے۔ بھٹو صاحب کے بارے میں جیل کے تمام اختیارات فوجی افسران یعنی ایس ایم ایل اے وغیرہ کے پاس تھے۔ انہوں نے مجھے کہا تھا کہ جو چیز جیل مینول میں لکھی گئی وہی آپ کر سکتے ہیں۔

سوال: چودھری صاحب! جیل مینول میں ایک سے زائد آدمی سزائے موت کے قیدی سے مل سکتے ہیں۔ جب فوجی حکام نے آپ کو جیل مینول کے مطابق کام کرنے کو کہا پھر بے نظیر اور نصرت بھٹو صاحبہ کو کیوں اکٹھے ملنے نہیں دیا جاتا تھا؟

جواب: میرا مطلب یہ نہیں کہ انہوں نے تحریری طور پر حکم دیا تھا کہ جیل مینول کے مطابق بھٹو صاحب کے ساتھ سلوک کیا جائے لیکن عدالت کے نوٹس میں لا کر اور فوجی افسران سے ہدایت حاصل کرنے کے بعد کسی بھی بات پر عمل ہوتا تھا۔ نصرت بھٹو اور بے نظیر

کے بارے میں انہوں نے صاف کہا تھا کہ صرف ان دو کی ملاقات ہوگی وہ بھی الگ الگ۔ یہ ہدایت حکومت نے بھیجی تھی اور فوجی افسران (ایس ایم ایل اے اور ڈی ایم ایل اے) نے ان دونوں کی ملاقات کروائی۔ اس کے علاوہ حکومت نے 30 مارچ 1979ء کو ہمیں خط بھیجا جس میں لکھا تھا کہ:

"Zulfiqar Ali Bhutto should be hanged at 2 a.m.

سوال: By the Order of Chief of Army Staff. Chief Marshall Administrator?

جواب: yes اور یہ حکم بھی جاری کیا گیا اور ملاقات کے بارے میں بھی کہا گیا کہ نصرت بھٹو اور بے نظیر کی اکیلے اکیلے ملاقات کروانی ہے۔

سوال: وہ دونوں اکٹھی نہیں مل سکتی تھیں؟

جواب: نا نا نا! وہ پہلے اکیلے ایک ایک کر کے ملاقات کرتی تھیں لیکن پھانسی کے دن ان دونوں کو اکٹھے بھٹو سے ملنے کی اجازت تھی۔ جب ہم ایک دن عدالت سے واپس آئے تو بھٹو صاحب اپنے سیل کے صحن میں بیٹھ گئے اور مجھے بھی بلایا۔ مجھ سے پوچھنے لگے، یار محمد، میں نے آپ کو سپریم کورٹ میں دیکھا اور کہنے لگے کہ آپ کو ججوں کا رویہ کیسا لگا؟ میں نے کہا سر میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ آپ خود وہاں تھے۔ آپ کی پارٹی کے Intellectuals ہیں وہ خود دیکھ سکتے ہیں۔ میں ایک ادنیٰ بندہ ہوں مجھے کیا پتہ کہ ججوں کے احساسات کیا ہیں۔ بھٹو صاحب نے پوچھا کہ کتنے میرے حق میں تھے اور کتنے میرے خلاف ہیں آپ کو کیا لگتا ہے؟ میں نے کہا کہ یہ تو بڑا مشکل سوال ہے جو آپ نے مجھ سے کیا۔ جتنا آپ مجھے سمجھ رہے ہیں اتنا تیز میں نہیں ہوں۔ بھٹو صاحب ہنس پڑے۔ اور کہا یار ہر آدمی کا ایک اندازہ ہوتا ہے۔ میں نے کہا سر ججوں کے نام مجھے نہیں آتے لیکن تین جج ایک طرف تھے اور دو دوسری طرف تھے۔ چیف جسٹس درمیان میں تھے۔ جب آپ بات کرتے تھے تو چیف جسٹس اور وہ تین جج اس کو تلخ لیتے تھے اور صاف ظاہر تھا کہ وہ خلاف ہیں۔ باقی جو دوسرے دو جج ہیں ان کا رویہ کسی حد تک آپ کے ساتھ نرم تھا۔ جب آپ کوئی ایسی ویسی بات کرتے تھے تو وہ آپ کو

سیدھا بھی کرتے تھے۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسا کہ وہ دو جج آپ کو لاؤڈ کر رہے تھے۔ ایک بات میں نے اور بھی بھٹو صاحب کو بتائی کہ سر یہ جو جسٹس نسیم حسن شاہ صاحب وہ چھوٹے جج، ان کا مجھے پتہ نہیں چلا کہ وہ آپ کے حق میں ہیں یا خلاف ہیں۔ یہ بات جب میں نے کی تو بھٹو صاحب نے میرا دایاں ہاتھ پکڑ کر And he kissed my hand انہوں نے کہا کہ اللہ یار

"You seemed to be simple man otherwise you are very intelligent"

حقیقت میں یہ تین جج جو تھے انہوں نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ ہم انصاف کریں گے تو دوسرے جتنے بھی جج تھے وہ حکومت کے تھے۔

سوال: باقی جو چار ملزمان تھے۔ ان کے ساتھ کیا ہوا تھا؟

جواب: انہیں کہا گیا تھا کہ آپ کو بَری کیا جائے گا بیان دینے کے بعد۔ انہیں لالچ دی گئی کہ آپ کو چھوڑ دیا جائے گا اور بھٹو کو پھانسی دی جائے گی۔

سوال: کسی نے ان میں سے اصرار نہیں کیا کہ پہلے پراپرٹی ہمارے نام لگا دی جائے؟

جواب: پشاور سے جو صاحب آئے تھے وہ ان پانچوں کے ضامن بن گئے تھے۔

سوال: ان سے کیا ملاقات پر پابندی تھی؟ کوئی ایسا آدمی نہیں تھا جو انہیں کہے کہ آپ نے سچ اور حق بات کرنی ہے؟

جواب: ان سے ملاقات پر پابندی نہیں تھی، اسی لیے ان پر پابندی نہیں تھی کیونکہ وہ انہیں اپنی طرف مائل کرنا چاہتے تھے۔ ان کے رشتہ داروں کو ان سے ملاقات کی اجازت تھی۔ کسی پر پابندی نہیں تھی جو نہیں مل سکتا تھا۔ دوسرا یہ کہ جب سماعت ختم ہونے لگی، وہ چاروں ملزمان اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ آپ ہمیں سنیں۔ جو کچھ کیا ہم نے کیا اور ہم نے یہ بھٹو صاحب کے کہنے پر کیا۔

سوال: چوہدری صاحب! لیکن جب ان ملزموں کو بھی بھٹو صاحب کی پھانسی کے کچھ عرصہ بعد پھانسی دی گئی پھر وہ آخری لمحات میں کیا کہہ رہے تھے۔ ان کے کیا جذبات تھے؟

جواب: ہمیں حکم آیا کہ انہیں اپنے اپنے ضلع کی جیلوں میں بھجوا دیا جائے۔ ہمیں آرڈر آیا تھا

انہیں ٹرانسفر کر دو۔

سوال: ایک ملزم کو راولپنڈی میں بھی پھانسی دی گئی؟

جواب: غالباً دی گئی ہوگی۔ ہوا یہ کہ ان سے بیان دلوا کر پھر انہیں بھی پھانسی دی گئی تھی۔

سوال: چوہدری صاحب! ذوالفقار علی بھٹو صاحب کے آخری نو دس دن، جب اپیل مسترد ہو جاتی ہے وہ احتجاج کرتے ہیں کہ وہی سوئچ، وہی بجلی کی تاریں، وہی سارا انتظام اور وہی سکیورٹی کے لوگ ان کے سیل میں پھر واپس آ گئے پہلے ان کی پانچ روزہ بھوک ہڑتال پر جو بھٹو صاحب کے مطالبات تسلیم کیے گئے تھے وہ پھر واپس لیے گئے اور بھٹو صاحب پھر بھوک ہڑتال پر چلے گئے۔ اس دوران وہ کیا کھاتے پیتے رہے؟

جواب: دراصل فوجی حکام نے کہا تھا کہ اب پوزیشن بدل گئی ہے۔ لہٰذا بھٹو کو جو فالتو سامان ملا ہے وہ نکالا جائے۔ ایس ایم ایل اے نے کہا کہ اگر اندر اب سوئچ وغیرہ رہیں گے تو ہو سکتا ہے کہ بھٹو صاحب خودکشی کریں تو ہمارے لیے ایک اور مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔ اب جتنی بھی چیزیں تھیں نکالی گئیں۔ حتیٰ کہ ان کی شیو کا سامان بھی وہاں سے ہٹایا گیا تاکہ کوئی بلیڈ وغیرہ ان کے پاس نہ رہے جس سے خودکشی کرنے کی کسی قسم کی کوشش کی جا سکے۔ ہمیں حکم دیا گیا کہ جب بھٹو صاحب نے شیو کرنی ہو تو ان کے ساتھ ایک بندہ بھیجیں اور انہیں شیو کرائیں۔ شیو کروا کے سامان واپس لے آئیں۔ بھٹو صاحب یہ سامان ہٹانے پر ناراض ہو گئے اور انہوں نے احتجاجاً بھوک ہڑتال کر دی کہ میرا سامان کیوں نکالا گیا۔ تاہم حکام نے چارپائی نکالنے کا نہیں کہا تھا لیکن بھٹو صاحب نے خود احتجاجاً چارپائی نکلوا کے باہر پھینک دی۔ بھٹو صاحب نے اپنی تلائی نیچے فرش پر بچھائی اور نو دن زمین پر لیٹے رہے۔ یہ وہ احتجاج تھا جو وہ اپنی موت کے ساتھ ہی اپنے ہمراہ لے گئے۔ انہوں نے پھانسی تک کوئی چیز نہیں کھائی۔ صرف چائے یا کافی پیتے تھے۔

سوال: آخری رات بھٹو صاحب پر تشدد بھی ہوا؟

جواب: نہیں، کوئی تشدد نہیں ہوا کیونکہ اس رات ہمارا آئی جی بھی موجود تھا، کرنل رفیع اور

مجسٹریٹ بھی تھا۔اس دن بھٹو صاحب پر تشدد کرنے کا کوئی جواز تھا نہ موقع تھا۔

سوال: سزائے موت سے پہلے قیدیوں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ آپ کو فلاں تاریخ اتنے بجے پھانسی دی جائے گی۔بھٹو صاحب کو اس بارے میں کیا مطلع کیا گیا؟

جواب: ہم نے بھٹو صاحب کو نہیں بتایا اس بارے میں۔یہ ان کو بتایا تھا کہ ان کی ملاقات بیگم بھٹو اور بے نظیر بھٹو سے ہوگی۔میں نے بیگم صاحبہ اور بے نظیر کو بتا دیا کہ یہ آپ لوگوں کی آخری ملاقات ہے۔"Bhutto is going to be hanged tomorrow" وہ دونوں اندر گئیں روئیں۔بھٹو صاحب نے ان سے پوچھا کہ آپ کیوں رو رہی ہیں تو انہوں نے بتایا کہ آپ کو کل پھانسی ہونے والی ہے اور یہ ہماری آخری ملاقات ہے بھٹو صاحب نے ڈیوٹی افسر کو بتایا کہ جاؤ سپرنٹنڈنٹ ''یار محمد'' کو بلاؤ۔میں آ گیا تو بیگم بھٹو اور بے نظیر کے لیے بھٹو صاحب کے سیل کے باہر کرسیاں رکھوائی گئی تھیں۔میں آ کر ان کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔بیگم نصرت بھٹو نے بے نظیر بھٹو کو کرسی سے اٹھا دیا اور مجھے بیٹھنے کو کہا لیکن میں نے بیٹھنے سے انکار کر دیا۔اس کے بعد بھٹو صاحب نے مجھ سے پوچھا ''یار محمد'' میری اہلیہ کہتی ہیں کہ یار محمد کا کہنا ہے کہ مجھے کل پھانسی ہونے والی ہے؟ تو میں نے بھٹو صاحب کو بتایا کہ سر میں نے اس لیے آپ کو نہیں بتایا کیونکہ آپ پہلے ہی ذہنی ٹارچر کا شکار ہیں اور یہ آپ کے لیے اضافی ذہنی ٹارچر ہوتا لہٰذا میں نے آپ کو بتانے سے گریز کیا اور آپ کی بیٹی اور اہلیہ کو میں نے بتا دیا کہ یہ آپ لوگوں کی آخری ملاقات ہے کیونکہ بھٹو صاحب کو کل پھانسی دی جائے گی۔

سوال: دونوں ماں بیٹی نے اکٹھے ملاقات کی؟

جواب: جی! دونوں نے آخری ملاقات بھٹو صاحب سے اکٹھے کی۔اس سے پہلے اکیلے اکیلے وہ ملاقات کرتی تھیں کیونکہ انہیں اکٹھے ملاقات کی اس سے قبل اجازت نہیں تھی۔

سوال: یہ کس نے کہا تھا کہ قانونی تقاضا پورا نہ کیا جائے اور بھٹو صاحب کو پھانسی دینے کے بارے میں نہ بتایا جائے؟

جواب: ایس ایم ایل اے نے بتایا تھا کہ بھٹو صاحب کو مطلع نہ کیا جائے لیکن میں نے پھر بھی

بیگم بھٹو صاحبہ اور بے نظیر کو بتا دیا، وہ دونوں جیل میں اکٹھے آئیں اور دونوں کو میں نے بتا دیا تھا۔

سوال: چوہدری صاحب! جب آپ نے بھٹو صاحب کو بتایا کہ یہ آخری ملاقات ہے تو چہرے پر کیا تاثرات تھے؟

جواب: وہ بیٹھے ہوئے تھے صحن کے اندر ملاقات ہو رہی تھی۔ باہر والا ایریا بھی بند تھا۔ سیل کے بالکل سامنے کرسیوں پر بیگم صاحبہ اور بے نظیر بھٹو بیٹھی تھیں اور بھٹو صاحب سلاخوں کے اندر تھے۔ دروازہ بند تھا۔ ملاقات سلاخوں کے پیچھے ہو رہی تھی۔ اندر بھٹو صاحب تھے اور ان کی اہلیہ اور بے نظیر باہر تھیں۔

سوال: ایک دوسرے کو وہ گلے بھی نہیں مل سکتے تھے؟

جواب: نہیں مل سکتے تھے، بس ہاتھ ملا سکتے تھے یا کندھے پر ہاتھ لگا سکتے تھے ایک دوسرے کو Practically جس چیز کو ملنا کہتے ہیں ایسا نہیں تھا۔

سوال: بھٹو صاحب بیٹی کو گلے نہیں لگا سکے؟

جواب: جی، نہیں لگا سکے۔

سوال: کیا تاثر تھا جب بھٹو صاحب کو پتہ چلا آخری ملاقات ہے؟

جواب: بھٹو صاحب یہی کہنے لگے کہ اگر ان لوگوں نے مجھے پھانسی ہی دینا تھی تو مجھے اتنا عرصہ ٹارچر کیوں کیا۔ کم سے کم عزت سے مجھے رکھتے۔ میں بہر حال بھٹو صاحب کو کیا جواب دے سکتا تھا۔ یہ ان کو بھی پتہ تھا کہ سپرنٹنڈنٹ جیل کے دائرہ اختیار میں کچھ ہے ہی نہیں کہ انہیں عزت سے رکھا جاتا۔ بھٹو نے درخواست بھی دی تھی کہ سپرنٹنڈنٹ جیل کو اپنے صوابدیدی اختیارات استعمال کرنے دیئے جائیں۔ یہ درخواست سپریم کورٹ کو دی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ یہ جیل آرمی کی طرف سے چلایا جا رہا ہے۔

سوال: چوہدری صاحب! بھٹو صاحب کے بارے میں ان کی فیملی یا لوگوں کی طرف سے رحم کی اپیلوں کی درخواستیں آپ کے پاس پوسٹ کے ذریعہ ٹیلی گرام میں آتی رہیں۔ کس کس نے رحم کی درخواست دی تھی اور آپ نے کیا یہ درخواست ضیاء الحق کو

بھجوادی تھیں؟

جواب: ایک درخواست ممتاز بھٹو کی طرف سے براہ راست تھی۔ ایک امیر بیگم کی طرف سے تھی یہ دو درخواستیں مجھے براہ راست آئیں وہ میں نے طریق کار کے مطابق ہوم سیکرٹری کو بھیجی تھیں۔ ہوم سیکرٹری نے گورنر کو بھیج دیں اور گورنر نے مسترد کر کے صدر کو بھیج دیں۔ اچھا اس میں ایک اور ان کا ڈرامہ تھا۔ انہوں نے وہ گورنر کی طرف سے مسترد کی گئی درخواستیں مجھے واپس نہیں بھیجیں۔ جس دن صدر صاحب نے بھی ان درخواستوں کو مسترد کر دیا۔ تو وہاں سے ایک افسر By hand لے کر وہ درخواستیں آیا کہ یہ مسترد ہونے کا حکم ہے۔ اس کے بعد جیل کو انہوں نے مکمل سیل کر دیا۔ اندر کا کوئی آدمی باہر نہیں جا سکتا تھا اور باہر کا آدمی اندر نہیں آ سکتا تھا۔

سوال: جیل سپرنٹنڈنٹ اپنی ہی جیل میں قید ہے؟

جواب: جی ہاں بالکل قید تھا اور دو دن میں گھر بھی نہیں جا سکا۔

سوال: بھٹو صاحب کو پھانسی دینے والے ''تارا مسیح'' کو کتنے دن پہلے لایا گیا؟

جواب: پھانسی کی رات کو ہی اس کو لایا گیا تھا۔

سوال: چوہدری صاحب! بھٹو صاحب کو جب پھانسی کے لیے جانے کے لیے سیل میں گئے، انہیں سٹریچر پر ڈالا، وہ خود گئے یا وہ گرے؟

جواب: آپ یہ بھی پوچھ رہے تھے کہ ان پر اس رات تشدد ہوا یا نہیں۔ رات 2 بجے کا وقت پھانسی کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ رات 12 بجے کے قریب میں نے بھٹو صاحب سے پوچھا ''بھٹو صاحب کیا کر رہے ہیں؟ انہوں نے کہا میں لیٹا ہوا ہوں۔ اچھا اس سے پہلے شام کو میں اور جیل مجسٹریٹ بھٹو صاحب کے پاس گئے اور انہیں وصیت لکھنے کے لیے کہا۔ بھٹو صاحب نے کہا کہ وصیت کتابوں میں لکھی گئی ہے، چھوڑو وصیتوں کو! پھر ہم نے انہیں کہا کہ ہم نے ریکارڈ میں رکھنا ہے۔ کچھ لکھ دیں۔ بھٹو صاحب نے کہا کہ مجھے کاغذ اور پنسل دیں میں لکھ دوں گا جو ہم نے انہیں فراہم کر دیں۔ ہم اپنے دفتر میں آ گئے اور ڈیوٹی آفیسر سے رابطے میں رہے۔ ڈیوٹی آفیسر نے کہا کہ بھٹو صاحب نے

وصیت لکھ دی اور لکھنے کے بعد لائٹر سے اس کو جلا دیا۔ جلانے کے بعد وہ راکھ زمین پر پھینک دی پھر اخبار کو جیسے جھاڑو بنا کر اس راکھ کو باہر پھینک دیا۔ پھر رات 12 بجے میں نے ڈیوٹی آفیسر کو کہا کہ آپ پتہ کریں۔ 2 بجے پھانسی ہونی ہے بھٹو صاحب نے نہانا ہوگا نماز پڑھنی ہوگی۔ یعنی جیل کے قواعد کے مطابق جو عمل اس وقت ہوتا ہے۔ ڈیوٹی آفیسر نے کہا کہ بھٹو صاحب نے راکھ باہر پھینکنے کے بعد سگار لگایا اور وہ سو گئے۔ مجھے نہیں پتہ اس وقت بھٹو صاحب کیسے سو گئے۔ وہ دراصل بعد میں پتہ چلا کہ یا بھٹو صاحب نے اس وقت کوئی نشہ آور چیز کھائی یا سگار کے ساتھ کوئی چیز ملا دی تا کہ انہیں پتہ نہ چلے کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ہو سکتا ہے جب بھٹو صاحب کو معلوم ہوا کہ انہیں اب پھانسی ہونے والی ہے تو انہوں نے نشہ آور چیز کھائی ہوگی۔ یہ میرا اندازہ ہے۔ میں نے ڈیوٹی آفیسر کو کہا کہ اٹھاؤ بھٹو صاحب کو۔ میں نے کہا کہ انہیں براہ راست نہیں اٹھانا وہ ناراض ہوں گے بلکہ آپ ڈیوڑی میں چلنا شروع کرو، بھٹو صاحب حساس انسان ہیں وہ آپ کے چلنے سے فوراً اٹھ جائیں گے اور اس کے بعد انہیں بتانا کہ آپ کی پھانسی کا وقت قریب آ گیا اگر آپ نے غسل وغیرہ کرنا یا نماز پڑھنی ہے تو پڑھ لیں۔ ڈیوٹی آفیسر نے بتایا کہ میں نے وہاں چکر لگائے لیکن بھٹو صاحب نہیں اٹھ سکے۔ میں نے ڈیوٹی آفیسر کو کہا کہ آپ بھٹو صاحب کو آواز دے کر جگاؤ اب ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ اس نے بھٹو صاحب کو آواز دی تو بھٹو صاحب پھر بھی نہیں اٹھے۔ اس کے بعد میں، آئی جی جیل خانہ جات، کرنل رفیع، ڈاکٹر ہم سب اکٹھے تھے۔ میں نے ان کو بتایا کہ بھٹو صاحب اٹھ ہی نہیں رہے انہیں آواز بھی دی گئی تھی۔ آئی جی نے مجھے کہا کہ آپ خود جائیں اور پتہ کریں بات کیا ہے۔ میں گیا اور بھٹو صاحب واقعی اس حالت میں تھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ خراٹے مار رہے تھے۔ ہم نے آواز دی بھٹو صاحب، بھٹو صاحب! واپس کوئی جواب نہیں آیا۔ ہم دفتر واپس آئے، مشورہ کیا، آئی جی کو بتایا کہ اب کیا کریں۔ ظاہر بات ہے میں نے آئی جی سے ہی پوچھنا تھا اس وقت وہ معاملات دیکھ رہے تھے۔ میں نے پوچھا اب کیا کریں بھٹو

صاحب تو بالکل ہل ہی نہیں رہے وہ ایسے بے ہوش پڑے ہیں۔ اب ان کی پھانسی کیسے ہوگی۔ وہاں آدمی جب تک تختہ دار پر کھڑا نہ ہو تو پھانسی مشکل ہے۔ انسان جب پھٹے پر کھڑا ہو تو پھر وہ پھندہ اس کے گلے میں ڈالا جاتا ہے۔ میں نے بتایا کہ یہ تو پھانسی ہی ممکن نہیں ہے۔ ایسی صورت میں کیا ہوگا خیر ان لوگوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس کا اور کوئی حل نہیں آپ بھٹو صاحب کو سٹریچر پر ڈال دیں۔ انہیں لے جائیں پھانسی گھاٹ، ہم پھر آئے اور بھٹو صاحب کو ہلایا جلایا بھٹو صاحب نے تھوڑی سی آنکھیں کھولیں۔ ان کی آنکھیں کلیجی کی طرح سرخ تھیں۔ میں نے کہا سر یہ مجسٹریٹ آ گئے ہیں آپ کی وصیت کی تصدیق کرنے کے لیے تو آپ کو وصیت کے لیے کاغذ دیا گیا تھا تو بھٹو صاحب نے کہا ''یار محمد'' وہ وصیت میں نے جلا دی۔ وصیت اب کتابوں میں لکھی جائے گی۔ خیر مجسٹریٹ چپ تھا۔ ڈاکٹر کو ہم نے کہا کہ ان کی حالت کو دیکھا جائے۔ انہوں نے بھٹو صاحب کا چیک اپ کیا اور انہوں نے مجھے بعد میں کہا کہ انہیں ''نروس بریک ڈاؤن'' ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ Nervous break down میں آنکھیں سرخ اور زبان میں لڑکھڑاہٹ وغیرہ پیدا ہو جاتی ہے۔ جس وقت بھٹو صاحب نے سگار پیا تھا 12 بجے اس وقت ان کی حالت خراب ہو گئی اور اس وقت انہوں نے کوئی چیز کھائی تھی۔ کیونکہ وہ مجھے پھانسی کے وقت کے بارے میں کافی اصرار کرتے تھے کہ کیا وقت ہے پھانسی کا۔ ہم اس لیے انہیں مقررہ وقت نہیں بتا رہے تھے کہ وہ کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھیں۔ ہم نے دیکھا کہ اس کے بعد ان کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ انہوں نے کوئی چیز کھائی تھی یا واقعی وہ Nervous break down تھا۔ باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ بھٹو صاحب کو سٹریچر پر ڈال کر پھانسی گھاٹ تک لے جایا جائے اور وہاں انہیں کھڑا کر دیا جائے۔ آئی جی بھی آ گئے دوسرے افسران پہلے ہی موجود تھے۔ افسران نے انہیں اٹھا کر سٹریچر پر ڈال دیا۔ اس وقت بھٹو صاحب تھوڑا تھوڑا بولے، کہنے لگے کیا کر رہے ہو؟ چھوڑو، اس طرح انہوں نے ہاتھ مار کر کہا چھوڑو مجھے، کیا کرتے ہو، چھوڑو چھوڑو۔'' بھٹو صاحب کو سٹریچر پر

رکھ دیا گیا۔

مجھے اس ساری صورتحال سے تکلیف شروع ہوئی۔ میں کھڑا ہو گیا اور وہ لوگ بھٹو صاحب کو سٹریچر پر اٹھا کر لے گئے۔ میری ڈیوٹی تھی میں بھی آہستہ آہستہ گیا۔ جب میں پھانسی گھاٹ پر پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ بھٹو صاحب تختہ دار پر خود کھڑے ہو گئے۔ دو آدمیوں نے انہیں تھوڑی سی سپورٹ دی ہاتھ سے اور وہ کھڑے ہو گئے۔ میں بھی وہاں پہنچ گیا وہاں سیڑھیاں ہوتی ہیں اوپر چڑھ کر جانا پڑتا ہے۔ میں بڑی مشکل میں تھا۔ مجھے درد شروع ہو گیا تھا۔ اس وقت تارا مسیح نے بھٹو صاحب کے گلے میں وہ پھندا ڈال دیا۔ بھٹو صاحب کے ہاتھ پیچھے باندھ دیئے گئے تھے۔ بلکہ میں نے انہیں اس وقت ہاتھ باندھتے ہوئے نہیں دیکھا بلکہ جب آدمی کھڑا ہو جاتا ہے تختہ دار پر تو اس کے پیروں کو رسیوں سے باندھ دیا جاتا ہے اور ہاتھ پیچھے باندھ دیئے جاتے ہیں۔ یہ قانون میں ہے کیونکہ کہا جاتا ہے اس میں یہ حکمت ہے کہ اگر آدمی پھانسی پر لٹکاتے وقت نیچے گرتا ہے تو اس کا جسم پھڑکتا ہے تو اس سے انسان کے جسم کے اعضاء علیحدہ ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ ہاتھ پیر باندھنے سے یہ اعضاء قابو میں رہتے ہیں صرف گردن پر بوجھ پڑتا ہے تو اس سے اس کی موت واقع ہوتی ہے۔ جب میں اوپر گیا تو بھٹو صاحب کہہ رہے تھے۔ اس کو کھولو اس کو کھولو یہ مجھے تکلیف دے رہا ہے۔ ان کی زبان میں ہکلاہٹ آ گئی تھی وہ آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے اس کو کھولو، اس کو کھولو۔ پھر ان کا آخری لفظ یہ تھا "Finish it!" پہلے ایک دو دفعہ کہا کہ اس کو کھولو اس کو کھولو یہ مجھے تکلیف دے رہا ہے۔ یعنی ہاتھ پیچھے ہتھکڑیوں سے بندھے تھے۔ جب نہیں کھولے گئے تو انہوں نے کہا Finish it یعنی ختم کرو اس کو۔ اس کے بعد تارا مسیح نے لیور دبا دیا اور بھٹو صاحب نیچے گر گئے۔

سوال: چوہدری صاحب! ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بعد انہیں تختہ دار سے نیچے لایا گیا۔ اس کے بعد کیا ہوا؟

جواب: معمول کے مطابق یہ ہوتا ہے کہ ہم نے Dead body اس کے لواحقین کے حوالے کرتا

www.bhutto.org

ہوتی ہے لیکن بیگم بھٹو اور بے نظیر نظر بند تھیں اور کوئی آیا بھی نہیں۔ ہم کس کو ان کی Dead body دیتے۔ ان کی پلاننگ بھی پہلے یہی تھی۔

بھٹو صاحب کی پھانسی کے بعد کرنل رفیع نے زبانی کہا کہ اب آگے میرا کام ہے۔ میں نے بھٹو صاحب کو غسل دینا ہے آپ بیٹھیں۔ میں آئی جیل خانہ جات اور دیگر افسران کے ساتھ بیٹھ گیا۔ خیر بھٹو صاحب کو پھر رسی سے نیچے اتارا گیا تختہ دار کے عقب میں پہلے سے ایک پردہ لگایا گیا کہ یہاں بھٹو صاحب کی میت کو غسل دینا ہے۔ کوئی ایک مولوی بھی Hire کیا ہوا تھا، وہاں میت کو پردے کے پیچھے لے جایا گیا۔ اس کو غسل دیا گیا۔

سوال: تصاویر بھی بنائی گئیں؟

جواب: ہاں! روشنی آ رہی تھی فلش لائٹ کی۔ لگتا ہے کہ بنائی گئیں۔ لیکن میں وہاں گیا ہی نہیں۔ مجھے پہلے ہی دوسرے لفظوں میں کہا گیا تھا کہ میں وہاں ہی بیٹھ جاؤں۔

سوال: بھٹو صاحب کی پھانسی گھاٹ پر لٹکتے ہوئے بھی تصاویر بنائی گئیں؟

جواب: نہیں میں نے دیکھا نہیں۔

سوال: لیکن پردے کے پیچھے تصاویر بنائی گئیں؟

جواب: جی وہاں بنائی گئیں اس کی لائٹس پڑتی رہیں۔ اس میں کچھ تصاویر بن گئیں پتہ نہیں کتنی بنیں۔

سوال: بھٹو صاحب کے سیل سے جو سامان نکلا وہ آپ نے لسٹ بنا کر بے نظیر بھٹو صاحبہ کو دیا؟

جواب: جی، وہ ان کے حوالے کر دیا گیا۔

سوال: وہ دینے کون گیا تھا؟

جواب: اس کا نام مجید قریشی تھا وہ لسٹ کے اوپر دستخط کروا کے لایا تھا۔

سوال: بھٹو صاحب کی گھڑی تھی، کرنل رفیع صاحب کا کہنا ہے کہ بھٹو صاحب نے کہا تھا باہر جو سنتری ہے یہ گھڑی اس کو دے دی جائے۔ کیا ایسی بات تھی؟

جواب: کوئی نہیں، میں کہتا ہوں کہ میں کتنی مرتبہ گیا، ہر وقت وہاں تھا۔ روز بھٹو صاحب کے

پاس جاتا تھا۔ مجھے انہوں نے کبھی نہیں کہا کہ گھڑی اس کو دے دینا یا کوئی ایسی بات۔

سوال: بھٹو صاحب کی رنگ (انگوٹھی) چوری ہونے کا بھی کوئی واقعہ ہے، ان کی رنگ گر گئی تھی پھر وہ تارا مسیح نے اٹھالی یا کسی اور نے؟

جواب: مجھے کسی نے نہیں بتایا کیا کرتا ہے کیونکہ پھانسی کے وقت ہی مجھے کہا گیا تھا Now your job is finished میں سیڑھیاں اتر کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ آگے سارا کام کرنل رفیع ہی کرتا رہا۔

سوال: بھٹو صاحب کے سامان کی لسٹ کس نے بنائی تھی۔ بھٹو صاحب سے 434 روپے کچھ پیسے برآمد ہوئے۔ رنگ، گھڑی اور دوسرا سامان برآمد ہوا؟

جواب: کرنل رفیع نے لسٹ بنائی ہوگی میں نے نہیں بنائی، مجھے نہیں پتہ۔

سوال: وہ لسٹ انگریزی میں لکھی گئی ہے؟

جواب: کرنل رفیع نے مجھے بتایا کہ یہ چیزیں ان سے برآمد ہوئیں اور اس کی ہم نے یہ لسٹ بنائی ہے چونکہ بیگم صاحبہ اور بے نظیر آپ کی تحویل میں ہیں لہٰذا یہ لسٹ ان کے پاس لے جائیں اور ان سے رسید لیں۔ میں نے ایک اسسٹنٹ کو بھیجا کہ جائیں اور ان سے رسید لے لیں اور چیزیں ان کے حوالے کر دیں۔ بلکہ بے نظیر نے وہ چیزیں خود مانگی تھیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ بے نظیر نے کہا تھا کہ بھٹو صاحب کی ایک انگوٹھی ہے جو بھٹو صاحب کی منگنی کی ہے وہ بیچ میں نہیں ہے۔ بے نظیر نے کہا کہ یہ انگوٹھی انہیں بہت پیاری تھی لہٰذا ہمیں اس کی ضرورت ہے۔ وہ آپ کہیں سے پیدا کریں۔ میرا خیال ہے کہ وہ انگوٹھی کرنل رفیع کے پاس تھی۔ اس نے وہ دی اور وہ انگوٹھی بھی پھر ہم نے واپس کی۔

سوال: باقی ساری چیزیں واپس کی تھیں انگوٹھی نہیں دی تھی وہ رکھ لی گئی تھی؟

جواب: جی! چونکہ بے نظیر نے ڈیمانڈ ہی انگوٹھی کی کی تھی کہ وہ منگنی کی انگوٹھی تھی۔

سوال: چوہدری صاحب کیا ایسا نہیں ہے کہ بے نظیر اور نصرت بھٹو صاحبہ آپ کی تحویل میں نظر بند تھیں کہ انہیں بھی بھٹو صاحب کے جنازے کے لیے بھیجا جاتا تا کہ وہ آخری

رسومات میں شامل ہوتیں؟

جواب: میں عرض کر رہا ہوں کہ ایسا ممکن ہی نہیں تھا چار دیواری سے باہر میری کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ تو اب ان لوگوں کو دوسرے صوبے میں بھیجنا میری دسترس میں نہیں تھا۔ میں ایسا کام نہیں کر سکتا تھا۔

سوال: اس تفصیلات سے بھی آگاہ کریں چوہدری صاحب نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو نظر بند تھیں اور آپ کے ماتحت تھیں۔ اس دوران جب وہ بھٹو صاحب سے ملنے آتی تھیں تو ان کے پرس کی تلاشی پر بھی جھگڑا ہوا نصرت بھٹو صاحبہ اور بے نظیر دونوں ناراض تھیں، وہ کیا واقعہ تھا؟

جواب: بٹالین انچارج کرنل رفیع صاحب نے مجھے بتایا کہ ایس ایم ایل اے صاحب کا کہنا ہے کہ یہ پرس ساتھ لے آتی ہیں لہٰذا شک ہے کہ وہ بھٹو صاحب کے لیے شراب لے آتی ہیں کیونکہ بھٹو صاحب شراب کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لہٰذا ملاقات کے دوران نصرت بھٹو شراب لے آتی ہیں۔ اس کو روکنے کے لیے کارنر پر ایک پردہ سا لگا کر جس طرح ہسپتال میں Curtain لگا ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے بیگم بھٹو کی ذاتی تلاش بھی ہو اور ان کی طرف سے لایا جانے والا سامان آپ خود یا ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل دیکھے۔ بیگم صاحبہ اور بے نظیر کی Physical تلاشی خاتون وارڈن لے گی۔ تب وہ اندر جا سکتی ہیں۔ میں نے انہیں کہا تھا کہ یہ ناممکن ہے۔ مجھے پتہ چلا کہ جب کیس زیر سماعت تھا تو اس وقت بھی انتظامیہ نے تلاشی کی کوشش کی تھی تو اس وقت بہت فساد برپا ہوا تھا۔ لہٰذا تلاشی لینے سے بڑی مشکلات پیدا ہوں گی۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ آپ بے شک ایس ایم ایل اے صاحب کو بتا دیں۔ یہ لوگ چلے گئے تو میں نے آئی جی جیل خانہ جات کو بتایا کہ فوجی افسران بیگم صاحبہ اور بے نظیر کی Physical تلاشی کا کہہ رہے ہیں۔ انہوں نے بھی مجھے کہا کہ یہ بڑا مشکل کام ہے۔ اس کام نے کوٹ لکھپت اور لاہور میں بھی ہمیں مشکل میں ڈال دیا تھا۔ لہٰذا کوشش کریں کہ فوجی افسران کو سمجھا دیں کہ وہ ایسا نہ کریں مگر اگر وہ بضد ہوں تو پھر ایسا کرنا پڑے گا۔ چنانچہ میں نے اپنے ڈپٹی

سپرنٹنڈنٹ کو بلایا میں نے کہا کہ بھائی ہم تو دونوں طرف سے مصیبت میں پھنس گئے اگر کریں گے تو بھی مصیبت ہے اگر نہیں کرتے تو فوجی افسران کے حکم کی خلاف ورزی ہوگی اور وہ اوپر شکایت کریں گے کہ ہم ان کی بات نہیں مانتے۔ اب کیا کیا جائے؟ بالآخر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم Physical تلاشی نہیں لیتے۔ اس سلسلے میں میں نے خود انکار کر دیا اور ایس ایم ایل کو میں نے خود Request کی کہ ایسا نہیں کیا جائے۔ میں نے انہیں کہا کہ آپ مجھے مشکل میں نہ ڈالیں۔ اگر ایسا کیا جائے تو فساد برپا ہوگا۔ لہٰذا آپ مہربانی کر کے تلاشی کے آرڈر کو Review کریں بلکہ سامان کی تلاشی ہم لے لیا کریں گے کہ کوئی قابل اعتراض چیز نہ ہو چنانچہ میں نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کو کہا کہ ایسا کریں جب گاڑی کھڑی ہو آپ نصرت بھٹو کو باتوں میں لگا کر آگے لے جائیں اور میں خود سامان میں دیکھ لوں کہ کوئی قابل اعتراض چیز نہ ہو تا کہ فوجی افسران کو اندازہ ہو کہ ہم نے تلاشی لے لی۔ ایسا ہی ہوا جب نصرت بھٹو صاحبہ اندر چلی گئی تو میں نے پرس کی زپ کھولی آواز آئی تو انہوں نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا۔ انہوں نے شور مچایا اور Shout کیا۔ تم نے ایسا کرنے کی جرأت کیسے کی۔ You are this and that ہم تلاشی کی اجازت نہیں دیں گے۔ یہ ہماری Insult ہوتی ہے۔ ہماری گاڑیوں میں تلاشی لینا بڑی بے عزتی کی بات ہے۔ میں نے کہا کہ بیگم صاحبہ آپ اس طرح شور نہ کریں۔ عزت کی بات ہوتی ہے۔ عزت کریں اور کروائیں۔ یہ حکم ہے کہ آپ کی بھی تلاشی لی جائے اور آپ کے سامان کی بھی۔ تو ہم آپ کا لحاظ کر رہے ہیں کہ صرف سامان کو دیکھ رہے ہیں کہ اس میں کوئی ناجائز چیز نہ ہو ورنہ آپ ملاقات نہیں کر سکتیں۔ میں نے ان کا وہ بیگ پکڑا تھا تو انہوں نے زور سے میری کلائی پکڑ لی اور بیگ کو کھینچنے کی کوشش کی۔ انہوں نے کہا کہ نہیں ہوتی ملاقات نہ ہو لیکن ہم تلاشی نہیں دیتے جو بیگ میں نے پکڑا اس نے ایسا کیا کہ بیگ میرے ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے اتنی زور سے کھینچا کہ ان کا اپنا ہاتھ ان کے سینے پر لگا۔ نصرت بھٹو نے رونا شروع کر دیا اور گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ ایس پی صاحب ساتھ تھے اس کو کہنے لگیں کہ دیکھیں

سپرنٹنڈنٹ نے مجھے چھاتی پر Push کیا ہے۔ ایس پی نے کہا کہ بیگم صاحبہ نہیں ایسی بات نہیں ہے میں دیکھ رہا تھا کہ بیگ سپرنٹنڈنٹ کے ہاتھ میں تھا آپ نے اس کو کھینچنے کی کوشش کی تو آپ کا اپنا ہاتھ اپنے سینے پر لگا۔ سپرنٹنڈنٹ نے آپ کو نہیں مارا چنانچہ نصرت بھٹو نے کہا کہ میں ملاقات نہیں کروں گی لیکن بیگ کی تلاشی نہیں دوں گی۔ میں نے انہیں بیگ واپس کر دیا اور وہ گاڑی میں بیٹھ گئیں اور واپس چلی گئیں۔ اگلے دن اخبارات میں خبر چھپی کہ نصرت بھٹو کو دھکا مارا گیا۔ یہ سپر لیڈ چھپ گئی۔ پھر میں اندر گیا تو بھٹو صاحب نے مجھ سے پوچھا کیونکہ انہوں نے سن لیا تھا ایسا ہوا ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی تو میں نے انہیں صحیح صورتحال سے آگاہ کیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ تلاشی کے احکامات تھے تو نصرت بھٹو صاحبہ نے خود بیگ کھینچنے کی کوشش کی ان کا اپنا ہاتھ اپنے جسم پر لگا۔ میں نے انہیں Push نہیں کیا۔ بھٹو صاحب خاموش ہو گئے۔

سوال: اور کیا ایسا واقعہ بے نظیر بھٹو صاحبہ کے ساتھ بھی بعد میں پیش آیا؟

جواب: نہیں! اس دن کے بعد انہوں نے سامان لانا ہی چھوڑ دیا۔

سوال: اچھا! کبھی ایسا ہوا کہ نصرت بھٹو صاحبہ ایک کتی کا بچہ جس سے بھٹو صاحب پیار کرتے تھے ساتھ لے آئی تھیں اور وہ بھٹو صاحب کے سیل تک چلا گیا؟

جواب: نہیں! میرے علم میں ایسی بات نہیں ہے۔

سوال: ایسا نہیں ہے کہ یہ کہا گیا تھا کہ کرنل رفیع صاحب کا Claim ہے کہ نصرت بھٹو صاحبہ کسی کا ایک چھوٹا بچہ لے آئی تھیں جو بھٹو صاحب کے سیل تک گیا؟

جواب: کرنل رفیع صاحب اکیلے اندر نہیں جا سکتے تھے کم سے کم ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ان کے ساتھ ہوتا تھا یا میں خود ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ کرنل صاحب نہ میرے پاس آئے نہ مجھے ڈپٹی صاحب نے ایسی کوئی بات بتائی نہ ہی کسی ملازم نے مجھے بتایا۔ ایسا واقعہ میرے نوٹس میں نہیں ہے۔

سوال: ایسا واقعہ نہیں ہوا؟

جواب: نہیں!

سوال: جب بھٹو صاحب کی آخری اپیل بھی مسترد ہو جاتی ہے تو آپ بھٹو صاحب کے پاس آتے ہیں اور انہیں سمجھاتے ہیں کہ مفاہمت کا کوئی راستہ نکلے۔ کبھی ایسا بھی ہوا؟

جواب: نہیں، یہ تو اس ردعمل کے بعد نہیں۔ یہ سپریم کورٹ کی اپیل مسترد ہونے کے بعد کرنل رفیع اتفاق سے میرے پاس بیٹھا تھا اور اس کو سپریم کورٹ سے اطلاع آئی کہ "Supreme court has rejected the appeal of Zulfiqar Ali Bhutto!" وہاں کرنل رفیع کے کچھ آدمی ہوں گے۔ ان لوگوں نے فون پر کرنل رفیع کو یہ بتایا۔ کرنل رفیع نے مجھے بتایا کہ اپیل نامنظور ہوگئی اور چلو ہمدردی کے طور پر ہم بھٹو صاحب کو بتا دیں کہ اپیل تو نامنظور ہوگئی اور ہم دونوں چلیں گے۔ ہم دونوں جا کر بھٹو صاحب کے سیل کے صحن میں بیٹھ گئے۔ بھٹو صاحب بھی وہیں تھے۔ میں نے ہی بات شروع کر دی میں نے کہا کہ "بھٹو صاحب آپ کی اپیل سپریم کورٹ میں نامنظور ہوگئی۔ بھٹو صاحب نے پوچھا کیا Unanimously مسترد ہوئی۔ سچی بات ہے میں سمجھ نہیں سکا کہ اس سے کیا مراد ہے۔ میں نے کہا جی ہاں! ہم یہ بات کر ہی رہے تھے اتنے میں ٹیلی فون آ گیا، ہمارا جو ڈیوٹی آفیسر تھا اس کے پاس بھی فون ہوتا تھا۔ وہاں سے گیٹ کیپر کا ڈیوٹی آفیسر کو فون آیا اس نے بتایا کہ بیگم بھٹو صاحبہ آ گئیں اور وہ بڑی گھبراہٹ میں ہیں وہ کہہ رہی ہیں کھولو، کھولو دروازہ ڈیوٹی آفیسر میرے پاس آ گیا یہ بات بتانے کے لیے میں اور کرنل رفیع اس وقت بھٹو صاحب کے پاس بیٹھے تھے۔ ڈیوٹی آفیسر نے کہا کہ بیگم صاحبہ آ گئی ہیں اور گیٹ سے اندر آنے کے لیے اصرار کر رہی ہیں۔ میں بہت حیران ہوا کہ بیگم صاحبہ نظر بند ہیں وہ کیسے آ سکتی ہیں۔ ان کو کس طرح کسی نے بھیجا ہے۔ چنانچہ میں اور کرنل رفیع دونوں بھٹو کی طرف دیکھ رہے تھے اور بھٹو ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ اگر میں اور کرنل رفیع بھٹو کے پاس نہ ہوتے تو ہم مشورہ کرتے کہ اب کیا کرنا چاہیے بیگم صاحبہ کو اندر آنے دیا جائے یا نہ دیا جائے۔ نہ یہ فیصلہ کرنل رفیع میرے بغیر کر سکتا تھا اور نہ میں اس کے بغیر کر سکتا تھا کیونکہ ہمیں اوپر سے کسی نے اس بارے میں اطلاع نہیں دی تھی۔ بہرحال میں نے کرنل رفیع کو کہا کہ

ڈیوٹی آفیسر کو بتا دو کہ بیگم صاحبہ کو آنے دیا جائے۔ اس طرح ڈیوٹی آفیسر نے گیٹ کیپر کو بتا دیا اور بیگم صاحبہ اندر آ گئیں۔ اندر آتے ہی انہوں نے شور شرابا کیا۔ انہوں نے بھٹو صاحب کو کہا کہ These Punjabies are against you انہوں نے ہی آپ کی اپیل سپریم کورٹ میں خارج کروادی۔ فیصلہ آپ کے خلاف آ گیا۔ لیکن گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں جبکہ جو سندھی تھے انہوں نے فیصلہ آپ کے حق میں دیا تھا۔ وہ بھٹو صاحب کو کہنے لگیں کے گھبرانا نہیں It will be all right وغیرہ وغیرہ۔ بھٹو صاحب نے بیگم صاحبہ کو بتایا کہ ان لوگوں نے مجھے بتایا کہ فیصلہ میرے خلاف Unanimously ہوا ہے۔ بیگم صاحبہ نے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہی تو بات ہے کہ یہ پنجابی آپ کے خلاف ہیں ان ججوں کی طرح وہ بھی پنجابی ہیں اور یہ بھی لہٰذا ان لوگوں نے ایسا ہی کہنا تھا۔ اس کے بعد وہ سیل میں چلی گئیں اور بھٹو صاحب بھی سیل میں چلے گئے۔ ہم ان کو باہر سے لاک کروا کے نکل آئے۔

سوال: اس ملاقات پر بھی کیا فوجی حکام کی طرف سے کوئی ردعمل آیا؟

جواب: اس بارے میں کرنل رفیع اور فوجی افسران کے درمیان بات ہوئی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ اس کو ان لوگوں نے پوچھا تھا۔

سوال: یعنی آپ نے کوشش کی تھی کہ بھٹو صاحب کی سزا ٹل جائے اور معاملہ طے پائے، کیا آپ نے ایس ایم ایل اے، ڈی ایم ایل اے سے رابطہ کیا کہ بھٹو صاحب کے ساتھ ان کے معاملات طے پائیں؟

جواب: جی! یہ جو نصرت بھٹو کہہ گئی تھیں کہ ہم نے ریویو پٹیشن کرنی ہے انہوں نے بعد ازاں سپریم کورٹ میں ریویو پٹیشن دائر کی۔ اب وہی جج تھے جنہوں نے پہلے فیصلہ سنا دیا تھا، ان کے پاس ہی ریویو پٹیشن چلی گئی تو میں نے بھٹو صاحب کو اکیلے میں کہا کہ جب سے آپ آئے ہیں آپ کو کہتا رہا کہ فوجی حکام کے ساتھ سمجھوتے کی کوئی صورت نکالیں۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ جن ججز نے آپ کے خلاف فیصلہ سنا دیا آپ نے پھر پٹیشن ریویو کی۔ اب وہ اپنے فیصلے کے خلاف فیصلہ کیسے دے سکتے ہیں صرف

جنرل ضیاء الحق جو صدر ہیں اس کو اختیار ہے کہ وہ سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کر سکتا ہے تو آپ نے کوئی بات نہیں سنی اس لیے وہی نتیجہ نکلا۔ یہ چند دنوں کی بات ہے آپ کی اپیل کا فیصلہ ہوگا تو پھر آپ کو سزائے موت ہوگی۔ بھٹو صاحب نے مجھے کہا کہ یار محمد اب تک میں بھی تسلیوں میں آ گیا، میرے ساتھی میرے تمام ذرائع حتیٰ کہ نصرت بھٹو اور بے نظیر بھی مجھے یہی تسلیاں دیتی رہیں کہ ہم نے عالمی سطح کے وی آئی پیز سے رابطے کیے ہیں اور انہوں نے یقین دلایا ہے کہ مجھے سزائے موت نہیں ہوگی لیکن اب آپ کی بات پر سوچنے پر مجبور ہوں۔ بہر حال اس معاملے میں سوچتے ہیں۔ میں واپس چلا آیا، کچھ دن تک بھٹو صاحب نے مجھے نہیں بلایا اور میں بھی نہیں گیا، کیونکہ مجھے یہ خوف تھا کہ میں ان کے ساتھ ہمدردی کر رہا ہوں کہیں حکام کو میرے خلاف نہ کر دیا جائے۔ رفیع بھی بھٹو صاحب کے Close ہوا تھا۔ وہ دوسرے چینل (فوج) کا آدمی تھا اور وہ فوجی حکام کو نہ بتائے کہ سپرنٹنڈنٹ بھٹو صاحب سے ہمدردی کا اظہار کرتا تھا اور اس طرح میں مصیبت میں پھنس جاؤں۔ اس لیے میں نے بھٹو صاحب کے پاس جانا چھوڑ دیا۔ ایک دن بھٹو صاحب نے مجھے بلایا۔ مجھے بلا کر کہا کہ یار محمد بات یہ ہے کہ میں نے بڑا سوچا ہے کہ اب تک مجھے یقین تھا کہ کوئی International Authority مداخلت کرے گی۔ کچھ ایک دو چیزیں تھیں کہ میں پر امید تھا کہ مجھے سزائے موت نہیں ہوگی لیکن اب مجھے بھی لگتا ہے کہ حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ آپ جو مجھے سمجھوتے کا کہتے تھے۔ اگر آپ اس بارے میں کوئی کوشش کر سکتے ہیں تو کر کے دیکھ لیں لیکن اس میں میرا نام نہ آئے کہ میں نے آپ کو کہا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ''بات باعزت ہو'' یہ ان کے الفاظ تھے بھٹو صاحب کے کہ ''باعزت طریقے سے اگر معاملات طے پاتے ہیں تو اس پر آپ بات کریں لیکن بتانا کسی کو نہیں۔ حتیٰ کہ بے نظیر اور نصرت بھٹو سے بھی بات نہیں کرنی۔ اگر آپ کو اس قسم کی کوئی یقین دہانی ہے کہ باعزت طریقے سے کوئی حل نکلے۔ فوجی حکام بتا دیں کہ وہ باعزت طریقے سے کوئی حل نکالنے کے لیے تیار ہیں پھر میں خود آپ کو بتا دوں گا اور میں خود پھر اس کو

ڈیل کروں گا۔ لیکن کوئی تیسرا آدمی اس میں نہیں ہوگا، میں نے بھٹو صاحب کو کہا کہ میں تو ہمدردی کے طور پر آپ کو کہتا تھا ورنہ میرا آرمی کے ساتھ کوئی لنک ہی نہیں ہے۔ ان کا اپنا چینل ہے۔ میرا چینل تو آئی جی جیل خانہ جات، ہوم سیکرٹری، چیف سیکرٹری کی طرف جاتا ہے۔ میرا تو آرمی سے کوئی رابطہ نہیں ہے اور نہ میں نے ان سے کبھی کسی قسم کی بات کی ہے۔ کرنل رفیع آپ کے پاس ہوتا ہے فوجی حکام ساری خبریں اس سے لیتے ہیں۔ جو کچھ اس نے بتانا ہوتا ہے وہ انہیں بتا دیتا ہے اور فوجی افسران بھی اس سے پوچھتے ہیں۔ میرا خاص طور پر کسی جنرل یا فوجی افسر سے کوئی رابطہ نہیں اور نہ ان لوگوں نے کبھی میرے ساتھ ایسی کوئی بات کی۔ میں آپ کو صرف رائے دیتا تھا۔ یہ تو اصل کام سیاستدانوں کے ہوتے ہیں تاکہ آپ کی پارٹی کے لوگ مل کر کوئی راستہ نکالیں۔ لیکن بھٹو صاحب نے کہا کہ میں نے وہ سارے لوگ آزما لیے۔ کوئی حل نہیں نکلتا۔ میں نے کہا کہ اچھا ٹھیک ہے سر! میں اس بارے میں سوچتا ہوں۔ میں سوچنے لگا کہ میں اب کیا کروں میرے پاس کوئی Source ہی نہیں۔ ایس ایم ایل اے کے ساتھ ان کے بھائی کی وجہ سے تھوڑے تعلقات میرے ان سے تھے کیونکہ ان کا بھائی میرا کلاس فیلو رہا تھا۔ ہم منڈی بہاؤالدین میں اکٹھے پڑھتے تھے۔ ان کا والد وہاں سول سرونٹ ہوا کرتا تھا۔ لہٰذا میں نے سوچا کہ کرنل رفیع حرامی آدمی ہے یہ چغلی مارتا ہے۔ لہٰذا یہ میرے ہی Status کا آدمی ہے۔ اس سے بات کرنے کا فائدہ ہی نہیں۔ اس سے بات کرنے کا مطلب ہی نہیں۔ اگر ہوتا تو بھٹو صاحب خود اس سے بات کرتے۔ بھٹو صاحب نے اب اس کام کے بارے میں مجھے بتا دیا لہٰذا مجھے خود اس بارے میں انسانی ہمدردی کے تحت کوشش کرنی چاہیے۔ میں نے سوچا کہ میں ایس ایم ایل اے راحت لطیف کے پاس ان کے دفتر چلا گیا۔ میں نے کہا کہ سر بات یہ ہے کہ ہمارے پاس پہلے بھی جو سویلین یعنی ایم ایل اے وغیرہ کے لوگ جیل میں قیدی کے طور پر آتے ہیں تو ہماری کوشش ہوتی ہے کہ حکومت اور ان کے درمیان معاملات طے پا ئیں۔ اس میں ابھی بات ہوتی ہے ایڈمنسٹریشن کے لیے بھی، ہمارے لیے بھی اور

ملک کے لیے بھی۔ میں نے راحت لطیف کو بتایا کہ سر بھٹو صاحب کو بھی میں نے حکام سے سمجھوتہ کرنے کو کہا لیکن بھٹو صاحب پہلے اس پر راضی نہیں تھے پہلے ان کا رویہ کافی سخت تھا لیکن اب لگتا ہے وہ راضی ہیں۔ سچی بات ہے کہ میں نے کھل کر یہ نہیں بتایا کہ بھٹو صاحب نے مجھے آپ سے بات کرنے کو کہا کیونکہ بھٹو صاحب نے مجھے سختی سے منع کیا تھا کہ ان کا نام نہ آئے لہٰذا میں نے اپنے طور پر راحت لطیف کو کہا کہ مجھے لگتا ہے کہ اب بھٹو صاحب سمجھوتے کے لیے تیار ہیں۔ لہٰذا بھٹو صاحب کے ساتھ سمجھوتہ ہو سکتا ہے اگر حکومت دلچسپی لے۔ ایک طرف سے میں ڈرتا تھا کہ وہ یہ نہ کہے کہ تمہارا اس میں کیا کام ہے۔ وہی ہوا کہ راحت لطیف نے مجھے کہا یار محمد You are just a custodian آپ کا یہ کام نہیں ہے کہ آپ صلح کراتے پھریں وہ بھی جب مارشل لاء لگا ہو۔ آپ مارشل لاء سے کیسے سمجھوتہ کروا سکتے ہیں۔ اس معاملے میں You are a little finger لہٰذا آپ کا یہ کام نہیں ہے۔ بھٹو صاحب کے جو رفقاء ہیں یہ ان کا کام ہے۔ وہ فوجی حکومت سے بات کریں۔ آپس میں وہ بات کریں۔ آپ کا اس میں کیا کام ہے؟ اس طرح میں واپس چلا گیا لیکن انہوں نے میری یہ بات ڈیم ایم ایل اے سے کر لی۔ اس وقت جنرل شاہ رفیع عالم ڈی ایم ایل اے تھے۔ ڈی ایم ایل اے نے مجھے اگلے دن بلایا۔ میں وہاں گیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ آپ صحیح صحیح بتائیں کہ آپ کے اور بھٹو کے درمیان کیا بات ہوئی ہے؟ میں نے سوچا کہ جو پہلی بات میں نے کی اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کا فائدہ بھٹو صاحب کو بھی نہیں ہوا اور فوجی حکام نے بھی پتہ نہیں کیا سوچا۔ جب بھٹو صاحب راضی ہیں اور وہ چاہتے ہیں اب معاملات طے پا ئیں۔ لہٰذا مجھے اب یہ بات بتا دینی چاہیے۔ میں نے شاہ رفیع عالم کو بتا دیا کہ سر وہ (بھٹو صاحب) صلح کے لیے اب راضی ہیں۔ اس نے اسی وقت اپنی گاڑی منگوا دی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ اس جگہ لے کر آئے جہاں آج آرمی ہاؤس ہے۔ ضیاء الحق وہاں بیٹھے تھے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے مجھے بتایا کہ گھبرائیے نہیں۔ مجھے پتہ ہے کہ آپ کو ہارٹ کا پرابلم ہے۔ آپ یہیں بیٹھیں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ آپ ادھر

باہر بیٹھیں۔ میں آپ کو تھوڑی دیر میں بلاتا ہوں۔ وہاں ساتھ ہی کے ایم عارف کا دفتر تھا اس کے ساتھ ہی جنرل ضیاء الحق کا دفتر تھا۔ انہوں نے مجھے باہر گیلری میں بیٹھنے کو کہا وہاں کرسیاں پڑی تھیں میں وہاں بیٹھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ آئے اور مجھے اندر آنے کو کہا میں اندر کے ایم عارف صاحب کے دفتر میں گیا اور وہاں وہ دو ہی آدمی تھے۔ شاہ رفیع عالم اور کے ایم عارف۔ مجھے بھی انہوں نے کہا کہ بیٹھ جاؤ۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ شاہ رفیع عالم نے مجھے کہا Be brief and to the point جو بات بھی بھٹو صاحب نے آپ کو کہی تھی وہ آپ Repeat کر دیں۔ میں نے وہی پرانی بات دہرائی کہ سر وہ یعنی بھٹو صاحب اب سمجھوتے کے لیے راضی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر باعزت طریقے سے معاملات طے پائیں تو میں راضی ہوں صلح کرنے کے لیے میرے پاس یہی بات ہے اس کے علاوہ کوئی نہیں۔ کے ایم عارف صاحب اس وقت سوچتے رہے اور Pen کو ہونٹوں کے ساتھ رکھ کر سوچنے لگے۔ اس کے بعد یہ دونوں اٹھ کر جنرل ضیاء الحق کے پاس چلے گئے۔ مجھے نہیں پتہ کہ ان تینوں کی آپس میں کیا بات ہوئی۔

سوال: تینوں یعنی جنرل ضیاء الحق جنرل کے ایم عارف اور جنرل شاہ رفیع عالم؟

جواب: جی! لیکن کیا باتیں ہوئی مجھے اس بارے میں معلوم نہیں، وہ واپس آ گئے اور مجھے کہتے ہیں چلیں۔ شاہ رفیع عالم نے مجھے پھر اس جیپ میں بٹھا دیا اور ہم چلے گئے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ میں نے آپ کی بات پہنچا دی ہے ان لوگوں تک۔ کرنا جو بھی ہے ان لوگوں نے ہی کرنا ہے۔ ان لوگوں کو بات پہنچا دی۔ اگر کوئی بات بنی تو I will let you now کرنا تو میں نے نہ آپ نے ہے یہ فیصلہ ان لوگوں نے ہی کرنا ہے۔ ان تک بات پہنچا دی۔ مجھے بھی پتہ چلا تھا کہ شاہ رفیع عالم کے خیالات بھٹو کے بارے میں ہمدردی کے تھے۔ مجھے کسی نے یہ بھی بتایا تھا مجھے نہیں معلوم اس میں کہاں تک صداقت ہے کہ جب کور کمانڈرز کی آخری میٹنگ ہوئی تھی اس میں بھٹو صاحب کو پھانسی دینے کا فیصلہ ہوا تھا۔ اس میں شاہ رفیع عالم نے کہا تھا Dont kill this man بھٹو صاحب کو ملک سے بے شک نکال دیں جو بھی کریں لیکن kill مت کریں۔ اس کو

پیش نظر رکھتے ہوئے انہوں نے شاہ رفیع عالم کو شفٹ بھی کر دیا تھا جس سے لگتا ہے کہ وہ بات صداقت تھی تو یہ بات ساری ہوئی تھی اس دوران۔ اس کے بعد نہ ہمیں کوئی Response آیا اور نہ شاہ رفیع عالم کی طرف سے اور نہ ہی سی ایم ایل اے کی طرف سے کوئی اطلاع ملی۔ اس کے فوراً بعد پھر بھٹو صاحب کی اپیل مسترد ہونے کے احکامات آئے۔

سوال: چوہدری صاحب! ذوالفقار علی بھٹو کیس میں پانچ ملزمان تھے۔ ایک بھٹو صاحب جنہیں بڑا ملزم کہا جاتا ہے چار دیگر تھے انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف سپریم کورٹ میں بھی بیان دیا اور وہی جواز بنا ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دینے کا بھی۔ حقائق مختلف تھے۔ کیا ان چار ملزموں کو جیل میں آ کر بھٹو صاحب کے خلاف بیان دینے پر آمادہ کیا۔ راضی کیا یا کوئی لالچ دی یا کوئی وعدے دیئے گئے کہ آپ کو چھوڑ دیا جائے گا کہ آپ خلاف بیان دیں؟

جواب: دراصل وہ لوگ جماعت اسلامی سے متعلق بتائے جاتے تھے اور ان میں سے غلام عباس ایک تھے جو غالباً ڈپٹی ڈائریکٹر تھے ایف ایس ایف کے، وہ نہیں مانتے تھے۔ کوششیں انڈر گراؤنڈ ہو رہی تھیں۔ ملاقاتیں ان کی کرنل رفیع کرواتا تھا اپنی نگرانی میں۔ ایک ہمارا اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جیل ہوتا تھا ان کے ساتھ۔ مجھے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جیل نے بتایا کہ جو ملاقاتی باہر آئے ہیں ان ہی سے بعض نے غلام عباس پر بہت پریشر ڈالا کہ آپ بھٹو صاحب کے خلاف بیان دیں کہ میں نے جو بھی کیا بھٹو صاحب کے کہنے پر کیا۔ لیکن غلام عباس راضی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں بوڑھا آدمی ہوں زندگی میں پتہ نہیں کیا کیا گناہ کیے لہٰذا یہ ایک بے گناہ کی جان لینا غلط ہے۔ جب بھٹو صاحب نے مجھے کہا ہی نہیں تو میں کیسے جھوٹ بول کر بھٹو صاحب کی جان گنوا دوں۔ انہیں کہا گیا کہ آپ کو رہا کر دیا جائے گا۔ بھٹو کو پھانسی دی جائے گی اور آپ کو Pending رکھا جائے گا اور اس کے بعد آپ کا فیصلہ ہوگا اور آپ کو عمر قید یا بری کر دیا جائے گا۔ لیکن انہوں نے اس دن بیان دینے سے انکار کیا۔ انہوں نے کہا کہ

میں اس بارے میں سوچوں گا۔ پھر یہ ملاقاتوں کا سلسلہ چلتا رہا تو مجھے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے بتایا کہ ایک سردار خان نامی جو غالباً پشاور سے آئے تھے۔ وہ ایڈووکیٹ جنرل یا ڈپٹی ایڈووکیٹ جنرل تھے مجھے پوری طرح یاد نہیں ہے۔ ان کو کسی اتھارٹی نے غلام عباس کو بھٹو صاحب کے خلاف بیان دینے پر راضی کرنے کے لیے لگا دیا گیا۔ وہ غلام عباس کا رشتہ دار تھا۔ پتہ نہیں غلام عباس اس کا بہنوئی تھا یا وہ بہنوئی تھا لیکن دونوں ایک دوسرے کے رشتہ دار تھے۔ تو سردار خان نے بالآخر غلام عباس کو بیان دینے پر راضی کر دیا اور یقین حاصل کیا کہ جو میں کہہ رہا ہوں یہ ہوگا۔ ساری باتیں مجھے نہیں پتہ لیکن غلام عباس نے یقین دلایا کہ جیسے آپ کہتے ہیں میں ایسے ہی کروں گا لیکن جو وعدے ہم سے کیے جا رہے ہیں اس کے آپ ذمہ دار ہیں۔ میں وہاں پر نہیں تھا لیکن مجھے ملازموں نے بتایا کہ ان چار ملزموں کو جائیداد کا، زمینوں کا لالچ دیا۔ سردار خان نے غلام عباس کو سزائے موت معاف کرنے کا کہا اور دوسرے لوگوں کو بھی کہا گیا کہ سزائے موت معاف ہوگی۔ سردار خان نے غلام عباس کو کہا کہ آپ بھٹو کے خلاف بیان دیں۔ جو آپ سے وعدہ کیا گیا میں اس کو پورا کرنے کی گارنٹی دیتا ہوں چنانچہ ہم نے دیکھا کہ جب بھٹو صاحب کا کیس سپریم کورٹ میں ہوا میں بھی دیکھنے گیا۔ میں نے وہاں دیکھا کہ بھٹو صاحب نے عدالت میں بڑی خوبصورت، خوبصورت کیا بلکہ بڑی دردناک تقریر کی اور عدالت کو حالات بتائے۔ جو میرے ساتھ ہونا تھا وہ تو ہوا۔ جو انہوں نے ایک سال میرے ساتھ سختیاں کیں وہ ناقابل برداشت ہیں۔ وہ میری برداشت سے باہر ہیں پتہ نہیں میں کیسے جی رہا ہوں۔ بہرحال بھٹو صاحب کی وہ باتیں ریکارڈ پر ہیں۔ انہوں نے سب کچھ بتایا جو ان پر گزری تھی۔ انہوں نے یہاں تک بتایا کہ جب میں پہلی دفعہ جیل آ رہا تھا اور جہاز سے اتر کر جیل آ رہا تھا تو مجھے قیدیوں کی وین میں بٹھایا گیا جس میں پیشاب کی بو تھی۔ اس میں قیدی بند رہتے ہیں وہ اس میں پیشاب کرتے ہیں۔ اس میں گھٹن ہو رہی تھی اور میں نے وہاں کافی اصرار کیا تھا کہ مجھے کسی اور وین میں ڈال دیا جائے۔ ساری

www.bhutto.org

فورسز آپ کی ہیں میں کہاں بھاگ کے جاؤں گا لیکن وہ نہیں مانے اور زبردستی اسی وین میں مجھے جیل لایا گیا۔ ہمیں بھی پتہ تھا کہ بھٹو صاحب کو راولپنڈی جیل لایا جا رہا ہے۔ ہم انتظار میں کھڑے تھے تو اس دوران چار پانچ گاڑیاں آ گئیں۔ پہلے پولیس کی گاڑیاں تھیں۔ پھر آرمی کی پھر سینٹر میں یہ پولیس وین تھی۔ ہم سوچ رہے تھے کہ بھٹو صاحب کسی کار میں ہوں گے۔ شاہد رفیع نے مجھے کہا تھا کہ آپ نے آگے ہو کر بھٹو صاحب کو لینا ہے ہم ان کے سامنے نہیں جائیں گے۔ ہم جب بھٹو صاحب کو وین سے نکالنے کے لیے گئے وہ نکلے ہی نہیں۔ انہوں نے کہا کہ جس گاڑی میں انہوں نے مجھے بٹھایا اس میں عام قیدی کو بھی گھٹن ہو جاتی ہے۔ میرے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ یہ میں یاددہانی سختیوں کے بارے میں کر رہا ہوں۔ یہ پہلے دن ہوا جب ان کو لایا گیا تھا۔ جب وہ جانے لگے تو وہی وین پھر آ گئی انہیں سپریم کورٹ لے جانے کے لیے۔ بھٹو صاحب نے اس میں بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ فوجی افسران نے ایک کرسی دی کہ وین میں ایک کرسی رکھ کر اس پر انہیں بٹھا دیں۔ اگر وہ پھٹے پر نہیں بیٹھتے تو چلو نہ بیٹھیں۔ کرسی پر بٹھا دیں۔ بھٹو صاحب نے کہا کہ میں کرسی کا کیا کروں آپ اندر وین کا حال دیکھیں۔ اس کے اندر سے بو آ رہی ہے اس میں داخل ہونا مشکل ہے۔ پھر میں نے انہیں کہا کہ دیر ہو رہی ہے سپریم کورٹ میں 9 بجے کا وقت تھا تو وہ لوگ بھی مجھ سے ناراض ہوں گے کہ سپرنٹنڈنٹ جیل نے وقت پر کیوں نہیں بھیجا۔ اگر کوئی عدالت نہ جائے تو سپرنٹنڈنٹ جیل کو پکڑتے ہیں۔ جو بھی فالٹ ہو لیکن جیل سپرنٹنڈنٹ کو ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ میں نے بھٹو صاحب کو کہا کہ میری سختی آ جائے گی لہٰذا مہربانی کر کے گزارہ کریں۔

سوال: چودھری صاحب بہت بہت شکریہ یہ تاریخ کا ایک مسنگ لنک تھا جو آج پورا ہو گیا اور آپ نے اس بارے میں تفصیلات بتائیں اور آئندہ مورخ تفصیلات لکھتے ہوئے آپ کی زبان سے ساری گفتگو تحریر کرے گا اور لوگوں کو تصویر کے دوسرے رخ کا بھی پتہ لگے گا۔ بہت بہت شکریہ!

ہوئے اپنے دوستوں کا بڑا احترام کرتا ہوں۔ میں اپنے جسم کے نشانات یا ایسی ہی کوئی اور چیز نہیں دکھانا چاہتا لیکن میں ضرور کہوں گا کہ مجھے کچھ کہنا ہے اور اگر اس دوران میں ان نکات کا تذکرہ کر بیٹھوں جن کا پہلے ہی ہو چکا ہے تو یہ بدنیتی سے نہیں ہوگا اور نہ ہی آپ کا وقت ضائع کرنے کا ارادہ ہے۔ میں موت کی چھوٹی سی کال کوٹھری سے بھی یہ دیکھ سکتا ہوں کہ اس مقدمہ کو جلد از جلد ختم کرنے کے لیے کیا دباؤ ہے۔''

''جناب والا! میں اپنے بارے میں گفتگو نہیں کرنا چاہتا نہ صرف میں مصیبت میں ہوں بلکہ میرا یقین ہے کہ عوام مصیبت میں ہوں گے انہیں افسوس ہوگا۔ یقین کیجئے۔ میرے ساتھ انتہائی ذلت آمیز برتاؤ کیا گیا۔ انتہائی ذلت آمیز! معاف کیجئے گا جناب والا! میں ایسا شخص نہیں جس کی جڑیں نہ ہوں۔ سادات ابھی تک اسرائیل کے ہاتھوں کھوئے ہوئے صحرا کی تلاش میں ہے۔ بیگن اسے اسرائیل کی سرزمین کہتا ہے۔ ہندو اس سرزمین کو بھارت ماتا کہتے ہیں۔ میں نے نوے ہزار جنگی قیدیوں کو بھارت کے چنگل سے نجات دلائی، پھر بھی میرے ساتھ مجروں کا سا برتاؤ کیا جا رہا ہے۔ میں مجرم نہیں ہوں۔ میں مجرم نہیں ہوں لیکن میرے ساتھ دوسرے ملزمان سے زیادہ خراب سلوک روا رکھا گیا ہے۔ میں موسیقی کی آواز سنتا ہوں۔ میں کال کوٹھری میں ان کے قہقہے سنتا ہوں۔ اس کال کوٹھری سے میں باہر تک نہیں نکل سکتا۔ جناب والا! نوے دن سے میں نے سورج کی روشنی نہیں دیکھی۔ 15 اکتوبر کو جب دو قیدی جیل سے فرار ہو گئے تو مجھے سیل میں بند کر دیا گیا۔ میرا ان کے فرار سے کیا تعلق تھا؟ تعلق کہاں تھا؟ میں اپنے ملک سے فرار نہیں ہو سکتا۔ میں اپنے ملک سے فرار نہیں ہوں گا۔ جناب والا! مری میں مصطفیٰ کھر نے مجھ سے کہا کہ میں ملک چھوڑ دوں انہوں نے کہا کہ یہ لوگ آپ کے خون کے پیاسے ہیں۔ میں نے کہا۔ نہیں۔ اگر تم جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔ میں اپنی جڑیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ 13 ستمبر کو نواب صادق حسین قریشی کی کوٹھی پر پریس کانفرنس کے بعد ایک غیر ملکی صحافی مجھے ایک طرف لے گیا اور اس نے کہا۔ ''بھٹو صاحب! میں نہیں بتا سکتا کہ آپ کے خلاف کیا کچھ ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ ملک چھوڑ دیں۔ میں آپ کا مداح ہوں۔'' میں نے اس صحافی کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں اُس سے زیادہ سننا نہیں چاہتا۔ بس اتنا ہی کہوں گا کہ میں اسے بھول نہیں سکتا۔ تب اس نے کہا۔ ''مہربانی کر کے لاڑکانہ نہ جائیں کہیں اور چلے جائیں۔ آپ نہیں جانتے کہ کیا ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا کہ میں لاڑکانہ ضرور

www.bhutto.org

جاؤں گا۔ اس دھرتی پر جہاں میں نے جنم لیا۔ اس دھرتی پر جس سے میرا تعلق ہے اور جہاں مجھے واپس جانا ہے۔ میں باہر نہیں جاؤں گا۔ جناب والا! میں کسی سے رحم کی بھیک نہیں مانگوں گا اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے میں رحم نہیں چاہتا میں انصاف چاہتا ہوں۔ میں محض زندہ رہنے کے لیے زندگی کی درخواست نہیں کر رہا ہوں۔''

''اگرچہ میرے وکلاء مجھ سے ملاقات کرتے ہیں مگر یہ ملاقات ایک چھوٹی سی تنگ اور گھٹن والی کوٹھری میں ہوتی ہے جس کی پیمائش 7x10 فٹ ہے اور وہاں کوئی بمشکل ہی گفتگو کر سکتا ہے۔ مجھے ان پر افسوس ہوتا ہے اور میں انہیں مقررہ وقت سے پہلے ہی جانے دیتا ہوں کیونکہ وہ بڑی بے آرامی محسوس کرتے ہیں۔''

''جناب والا! مجھے سونے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ کوٹ لکھپت میں پچاس پاگل تین ماہ تک میرے سیل کے قریب رکھے گئے۔ وہ ہمہ وقت چیختے چنگھاڑتے رہتے تھے اور میں بمشکل سو سکتا تھا۔ جب میں راولپنڈی لایا گیا تو پہلے یہ کھیل کھیلا گیا کہ میرے سیل کی چھت پر پتھر پھینکے گئے۔ پہلے میرا یہ خیال تھا کہ شاید میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ لیکن جب رمضان کے دوران میں رات کو نہیں سوتا تھا۔ میں سحری کا انتظار کرتا تھا مجھے ہر پندرہ منٹ کے وقفہ کے بعد ٹین کی چھت پر سے آواز سنائی دیتی تھی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ چھت پر پتھر مارے جا رہے ہیں۔ جب یہ کھیل بند ہوا تو ایک نیا طریقہ اختیار کیا گیا۔ میرے سیل کے بالکل قریب ایک پشتہ بنا ہوا ہے اور وہاں فوجی پہریدار ہیں۔ یہ پہریدار وقفہ وقفہ سے اس پشتہ پر کودتا تھا اور اس طرح پتھروں کی آواز کی جگہ فوجی جوتوں کی آواز نے لے لی۔ یہ آواز دو مرتبہ آتی تھی کیونکہ بظاہر وہاں صرف ایک پہریدار نہیں بلکہ کئی تھے۔ گذشتہ شب میرا خیال تھا کہ کیونکہ کل مجھے عدالت جانا ہے لہٰذا آج یہ آوازیں نہیں آئیں گی لیکن یہ آوازیں اس کے باوجود سنائی دیں۔ جناب والا! میں اس صبر آزما مصیبت کا سامنا اپنی ہمت، استقلال اور قوت ارادی سے کر سکا اور یوں بھی کہ میں ایک لیڈر ہوں اسی باعث میں یہاں آنے کے قابل ہوا۔ کوئی عام آدمی نہیں آ سکتا تھا۔ کوئی بھی عام آدمی ان حالات میں عرصہ پہلے ٹوٹ پھوٹ چکا ہوتا۔ آپ نہیں جانتے کہ میں کتنا پریشان ہوں۔ میں ختم ہو چکا ہوں پچیس دن سے میری موت کی کوٹھری میں پانی نہیں تھا پانی کل ہی بحال کیا گیا ہے مگر آپ چاہیں تو میں صبح نو بجے تو کیا آٹھ بجے بھی آنے کو تیار ہوں۔''

''مسعود محمود نے مجھ پر یہ الزام لگایا کہ میں نے اس سے یہ کہا تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو میں اپنے بیٹے میر مرتضیٰ بھٹو کو بھی قتل کر دوں گا جو میرا بیٹا اور وارث ہے جس پر مجھے فخر ہے کہ وہ آکسفورڈ میں ایک ذہین اور بہادر نوجوان ہے۔ میں نے اس کی تربیت کی ہے اور میں اس شخص سے کہتا ہوں کہ میں اپنے بیٹے کو بھی قتل کر دوں گا۔ جناب والا! اس بات کی ایک حد ہے کہ مجھے ایک ایسا وحشی قاتل کہا جا رہا ہے جو اپنے بیٹے کو بھی قتل کر سکتا ہے۔ میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے پالا ہے اور اس بیان کو رد نہیں کیا گیا بلکہ ایک لفافہ میں رکھ دیا گیا۔ اور یہ لڑکا ہی میرے لیے اپنی جان قربان کرے گا۔''

''عزت مآب مسٹر یحییٰ بختیار کو اشعار اور شاعروں کے حوالے پیش کرنے کے کافی مواقع فراہم کیے گئے مگر اپنی بات ختم کرنے کے لیے میں غالب کا ایک شعر پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جسے میں بے حد پسند کرتا تھا۔

رنج کا خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آسان ہو گئیں

مجھے یہ شعر بے حد پسند تھا۔ مگر عزت مآب غالب غلطی پر ہیں۔ غالب غلطی پر ہیں۔ یہ غلط ہے کہ مشکلیں اتنی پڑیں کہ آسان ہو گئیں آسان نہیں ہو سکتیں آپ ان کو برداشت کر سکتے ہیں آسان نہیں ہو سکتیں۔

اب عزت مآب آپ نے اردو بہتر بنانے کی ہدایت کی ہے۔ میں اردو میں زیادہ بلاغت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ عزت مآب جب ایک آدمی موت کی کوٹھری میں ہوتا ہے تو اس پر ایسی وارداتیں گزرتی ہیں جو اس سے پہلے کبھی نہیں گزری تھیں برصغیر میں شاید سرائیکی زبان ایک بہترین اور انتہائی شیریں زبان ہے اور میں ایک سرائیکی گیت کے ان الفاظ پر اپنی تقریر ختم کرنا چاہتا ہوں۔

درداں دی ماری جندڑی علیل اے

(18.19.20.21 دسمبر 1978ء سپریم کورٹ میں ذوالفقار علی بھٹو کا خطاب، یہ تقریر جناب ذوالفقار علی کی زندگی کی آخری تقریر ہے)

بلیک وارنٹ اور سزائے موت

سابق سیکرٹری داخلہ ایس کے محمود

سوال..... یہ زیادتی کس نے کی، آپ ہوم سیکرٹری تھے، ذمے دار کون تھا؟

ایس کے محمود..... حکومت نے فیصلہ کیا کہ یہ ہائی کورٹ کے اختیار میں ہونا چاہیے، اعلیٰ قابلیت کے حامل ججوں نے ہمیشہ اس بات پر اعتراض کیا اور کہا کہ پہلے اسے سیشن عدالت میں بھیجیں، ہم اس کی پہلی اپیل کے طور پر سماعت کریں گے، لیکن اس کے پیچھے مولوی مشتاق حسین تھے اور میں تو ان کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا، کیوں کہ یہ وہی آدمی تھے، جو بھٹو کے پاس اس وقت گئے جب وہ اقتدار میں آئے اور انہوں نے کہا کہ آپ کو اپنی حمایت کے لئے جج کی ضرورت ہوگی وہ دراصل چیف جسٹس بننا چاہتے تھے۔ بھٹو نہیں مانے اور اس پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ میرے پاس بہ طور ہوم سیکرٹری جب بھٹو کی پھانسی کے خلاف رحم کی درخواستیں آئیں تو میں نے رحم کی درخواست پر جو نوٹ لکھا، اس میں کہا کہ اتنی سنگین سزا مت دیں کیوں کہ اس سے آئندہ آنے والے برسوں میں آپ کی سیاسی زندگی متاثر ہو سکتی ہے یہ پھانسی ملک میں مزید تقسیم کا باعث بنے گی، جو کہ ایک بٹے ہوئے ملک کے طور پر پاکستان برداشت نہیں کر سکتا، آدھے سے زیادہ تو پہلے ہی بٹ چکا ہے چلیں اب اس کیس کا اصلی تناظر میں ہی جائزہ لیں، یہ نو (۹) ججوں پر مشتمل بینچ تھا مقدمے کی سماعت کے دوران دو ججوں جسٹس قیصر اور جسٹس وحید کو برطرف کر دیا گیا۔ ان دو ججوں کا موقف سب کو معلوم تھا اور وہ شاید پھانسی کے حق میں نہیں تھے اسی

لئے برطرف کر دیئے گئے۔ اب قانون یہ ہے کہ اگر ٹرائل کے دوران کسی بینچ میں خلل ڈالا جاتا ہے تو اس کی دوبارہ تشکیل کی جانی چاہیے اور نئے سرے سے ٹرائل ہوتا ہے لیکن ایسا نہیں ہوا، دوسری بات جو میں نے آپ کو بتائی کہ بھٹو کو دفاع کا موقع نہیں دیا گیا۔ تیسری بات یہ کہ آخر کار جب فیصلہ ہوا تو یہ چیز سامنے آئی کہ چاروں ججوں نے ایک طرف ووٹ دیا، جب کہ تین ججوں نے دوسری جانب ووٹ دیا، پنجاب کے تمام ججوں نے ایک جانب ووٹ دیا اور دوسرے صوبوں کے ججوں نے دوسری جانب ووٹ دیا، میں نے بھٹو کو پھانسی دینے کے خلاف رحم کی اپیل پر نوٹ لکھتے ہوئے کہا کہ ان حالات میں فیصلہ کرتے وقت چیف جسٹس کبھی ووٹ نہیں دیتا اور نہ ہی کبھی شریک ہوتا ہے لیکن جسٹس انوار الحق نے ایسا کیا اور اس طرح سے بھٹو کے خلاف فیصلہ اکثریت میں تبدیل ہو گیا اور دوسرا بنیادی قانون جو کہ میں ہوم سکرٹری ہونے کے ناتے جانتا تھا (کیوں کہ میں نے قانون بھی پڑھا ہوا تھا) کہ آپ سزائے موت نہیں دے سکتے، اگر اس میں شک کا عنصر ہو، یہاں شک تین ججوں نے خود پیدا کیا تھا، جو یہ کہہ رہے تھے کہ یہ غلط ہے۔ میں نے لکھا کہ صرف مسعود محمود کی گواہی پر اتنا بڑا فیصلہ کرنا غلط ہے، میں آپ کو بتاؤں، مسعود محمود مکمل طور پر ایک غیر ملکی طاقت کے اشارے پر کام کر رہا تھا، وہ امریکا کا آدمی تھا۔

سوال..... مسعود محمود کا امریکا سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟

ایس کے محمود..... مسعود محمود جیل میں تھا، تو ان کے کپڑے باہر سے سل کر آتے تھے، ان کو امریکا کا ویزا دیا گیا یہ سب کیا تھا، ملی بھگت نہیں تھی، تو کیا تھا اور مناسب وقت آنے پر امریکا والے انہیں امریکا لے گئے، امریکا سے دبئی جاتے ہوئے وہ وفات پا گئے۔

سوال..... کیا مسعود محمود ایک مشکوک کردار تھے؟

ایس کے محمود..... اصل میں اس مقدمے میں بھٹو اور ایف ایس ایف کے درمیان سازش اور منصوبہ بندی ثابت نہیں ہو سکی تھی، ایف ایس ایف کے سربراہ مسعود محمود حکومت سے مل گئے، ایف ایس ایف کے لوگوں کو ترغیب دے کر ان سے جھوٹی گواہی دلائی گئی اور بعد میں ان لوگوں کو بھی سزائے موت دے دی گئی، آپ مجھے یہ بتائیں کہ ایف ایس ایف اور بھٹو میں گٹھ جوڑ کیسے ثابت ہوا؟ جب گٹھ جوڑ ثابت نہیں ہوا، تو صاف ظاہر ہے کہ بھٹو کو سزا دینا لازمی طور پر غلط تھا۔

سوال.....آپ نے جب بھٹو کو پھانسی پر اختلافی نوٹ لکھا تو گورنر سوار خان اور جنرل ضیاء الحق ناراض نہیں ہوئے؟

ایس کے محمود.....گورنر نے میرے اس نوٹ پر کبھی دستخط نہیں کئے انہوں نے کہا کہ اگر آپ اس کو اسی طرح سمجھتے ہیں، تو خود ہی اس کو بھیج دیں، تو میں نے خود ہی اسے جنرل ضیاء الحق کے پاس بھیج دیا، لیکن گورنر نے اس پر دستخط نہیں کئے۔

جنگ.....لیکن مشہور تو یہ ہے کہ گورنر پنجاب جنرل سوار خان نے راتوں رات ہی پھانسی کے حکم پر دستخط کر کے آگے بھیج دیا تھا تا کہ اس کی جنرل ضیاء الحق سے وفاداری پر کوئی حرف نہ آئے؟

ایس کے محمود.....گورنر نے مجھے کہا تھا کہ راتوں رات بھیج دیں، لیکن انہوں نے اس پر کبھی دستخط نہیں کئے، بعد میں بہ طور وفاقی سیکرٹری داخلہ بھی میں نے وہ نوٹ دیکھا تھا، اس پر گورنر کے دستخط نہیں تھے۔

سوال.....تو کیا گورنر پنجاب جنرل سوار خان نے بھٹو کی پھانسی کی حمایت یا مخالفت میں کچھ نہیں لکھا؟

ایس کے محمود.....انہوں نے نہ حمایت میں کچھ لکھا اور نہ ہی مخالفت میں کچھ کہا، یہ سچ ہے۔

سوال.....آپ کے اختلافی نوٹ کے ساتھ اسے بھجوایا گیا؟

ایس کے محمود.....جی! میرے نوٹ کے ساتھ۔

سوال.....لیکن گورنر بھی تو اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے؟

ایس کے محمود.....ایسا کرنا ضروری نہیں ہوتا۔

سوال.....اصول تو یہی ہے کہ پھانسی کی سزا کے خلاف رحم کی اپیل پر پہلا فیصلہ صوبائی گورنر کرتا ہے؟

ایس کے محمود.....نہیں جی! سب سے پہلے رحم کی اپیل ہوم سیکرٹری کے پاس آتی ہے اور وہی اس پر فیصلہ کر کے آگے بھیجتا ہے۔

سوال.....ہوم سیکرٹری اسے گورنر کو بھیجتا ہے؟

ایس کے محمود.....پھر وہ اسے چیف سیکرٹری کو بھیجتا ہے، جو اس کے بعد اسے گورنر کے آگے پیش کرتا ہے۔ گورنر سوار نے مجھے کہا کہ ٹھیک ہے آپ نے لکھ دیا ہے، اب آپ اس کو خود ہی بھیج دیں، گورنر اسے خود نہیں بھیجنا چاہتے تھے۔ جنرل سوار خان بہت نرم دل انسان تھے، وہ اس سزا کو شاید پسند نہیں کرتے تھے، لیکن معاملہ حساس تھا، اس لئے انہوں نے خود کوئی رائے نہیں دی۔

سوال.....جنرل چشتی کا مؤقف ہے کہ جنرل سوار نے ضیاء الحق کو خوش کرنے کے لئے بھٹو کو پھانسی کے خلاف رحم کی اپیل پر راتوں رات دستخط کر دیئے تھے؟

ایس کے محمود..... جنرل چشتی کا کردار کبھی بھی قابل فخر نہیں رہا، یحییٰ خان کے مارشل لاء میں چشتی کراچی میں تھے، میں ڈپٹی کمشنر کراچی تھا اور یہ میرے ساتھ ہوتے تھے، انہوں نے کراچی میں کسی کی جائیداد ہتھیانے کی کوشش کی، میں نے انہیں روکا، اس بات پر انہیں معطل کر دیا گیا، یہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہوا۔

سوال.....آپ کے اختلافی نوٹ کی وجہ سے جنرل ضیاء الحق آپ سے ناراض تو ہوئے ہوں گے؟

ایس کے محمود..... بالکل! میں آپ کو بتاتا ہوں، میں اسی طرف آرہا تھا، جنرل ضیاء سزا پر فوری عمل درآمد کروانا چاہتے تھے، کیوں کہ انہوں نے میرے اختلافی نوٹ پر Rejected لکھ دیا تھا، انہوں نے فائل پر اور کچھ نہیں لکھا، بس یہی ایک لفظ Rejected ہی لکھا۔

سوال.....کیا آپ نے وہ فائل بعد میں دیکھی ہے؟

ایس کے محمود.....ظاہری بات ہے، یہ محکمہ داخلہ کی فائل ہے، جو ریکارڈ میں موجود ہے، پھر مجھ سے کہا کہ پھانسی کی سزا پر پرسوں کیوں نہیں عمل درآمد ہو سکتا۔

سوال.....آپ کو یہ کس نے کہا؟

ایس کے محمود.....جنرل ضیاء الحق نے۔

سوال.....کیا آپ کو یہ بات جنرل ضیاء الحق نے خود کہی تھی، یا کسی کے ذریعے پیغام دیا تھا؟

ایس کے محمود..... مجھے خود کہا تھا، کیوں کہ میں نے سزا پر عمل درآمد کے لئے انہیں ایک مہینہ دیا تھا، اس کیس کا فیصلہ ہو رہا تھا، تو بہ طور ہوم سیکرٹری مجھے یہ اختیار تھا کہ میں انہیں ایک مہینہ دوں، میں نے انہیں یہ مہلت دی، تا کہ حکومت ایک مرتبہ سوچ سکے کہ کیا وزیراعظم کے مرتبے کے شخص کو پھانسی دینا درست فیصلہ ہوگا؟ اس لئے میں نے انہیں ایک مہینے کا ٹائم دے دیا، اس پر جنرل ضیاء الحق بہت ناراض ہوئے، جنرل ضیاء نے مجھے کہا کہ جائیں اور جا کر چیف جسٹس انوار الحق سے ملیں، وہ آپ کو بتائیں گے اور آپ کا حکم تبدیل کریں گے، پھر سوار خان نے کہا کہ آپ میرا جہاز لے لیں، جا کر چیف جسٹس سے ملیں۔

سوال..... چیف جسٹس سے کیا بات چیت ہوئی؟

ایس کے محمود..... میں چیف جسٹس سے ملنے گیا، جسٹس انوار الحق میرے جاننے والے تھے، وہ میرے والد کے ساتھ کام کر چکے تھے، مجھے چیف جسٹس نے کہا، آپ نے تو سول سروس میں ابھی بہت آگے جانا ہے، تو آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں، آپ بھٹو کو وقت کیوں دے رہے ہیں؟ میں نے کہا کہ میں کیا کر رہا ہوں، میں نے تو کچھ غلط نہیں کیا، میں نے تو صرف یہ کہا ہے کہ اس فیصلے کے متعلق سوچیں۔ خوش قسمتی سے اس وقت اعجاز بٹالوی اور رحمٰن وہاں موجود تھے، انوار الحق نے کہا کہ آپ بھی اسے بتائیں تو اعجاز بٹالوی اور رحمٰن نے میری مدد کی اور کہا کہ یہ کہتے تو ٹھیک ہیں، تو چیف جسٹس نے کہا کہ ٹھیک ہے، میں صدر صاحب کو بتا دوں گا کہ آپ اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر راضی نہیں ہوئے۔ میں نے اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کیا۔

سوال..... تو کیا بھٹو کی پھانسی پر عمل درآمد ایک ماہ بعد ہوا؟

ایس کے محمود..... وہ مہینہ بھی گزر گیا، پھر دوسرا مرحلہ آیا، جب میں بھٹو سے ملنے کے لئے جیل گیا، میں عموماً ہر دوسرے تیسرے دن ہوم سیکرٹری ہونے کے ناتے ان سے ملنے کے لئے جیل جایا کرتا تھا۔

سوال..... بھٹو جس سیل میں بند تھے، وہ کتنا بڑا تھا؟

ایس کے محمود..... یہ چھوٹا سیل تھا، یہ ڈیتھ سیلوں کی طرح کا ایک سیل تھا، جو کہ کوٹ لکھپت میں تھا، پھر جب انہیں پنڈی شفٹ کیا گیا، تو وہ کچھ بہتر تھا، میں ان کے لئے کتابیں

لے جایا کرتا تھا، یحییٰ بختیار بھی ان سے ملنے کے لئے آیا کرتے تھے اور میرا خیال ہے کہ یحییٰ بختیار کے ذریعے ہی انہوں نے اپنی کتابیں باہر بھجوائیں۔

(If I am Assasinated) ''اگر مجھے قتل کر دیا گیا'' نامی کتاب اسی طرح سے باہر بھجوائی گئی اور اس رات دوسری مرتبہ انہوں نے کہا کہ اب میں کیا کہوں They have decided to do away with me، اس لئے میں اب ضیاء الحق سے کوئی اپیل نہیں کروں گا۔ بھٹو کو علم تھا کہ ضیاء الحق انہیں پھانسی دینے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ پھر میں نے کہا کہ آپ کی کوئی وصیت ہے؟ پھانسی کی سزا سے پہلے یہ سب کہنا پڑتا ہے، تو انہوں نے ایک کاغذ لیا اور اس پر ایک جملہ لکھا، جو کہ ان کی وصیت سے متعلق تھا کہ میں یہ کرنا چاہتا ہوں، پھر انہوں نے اس کاغذ کا ایک بال بنا کر پھینک دیا اور کہا کہ اس کا کیا فائدہ ہے؟ مستقبل خود فیصلہ کرے گا، یہ ان کے الفاظ تھے، جو میں آپ کو بتا رہا ہوں، پھر میں نے انہیں مزید پندرہ دن وصیت لکھنے کے لئے دیئے، آخری ملاقات کا دورانیہ عموماً آدھے گھنٹے کا ہوتا ہے، لیکن میں نے تین گھنٹے کی اجازت دے دی، میں نے کہا کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے، وہ شخص موت کی طرف بڑھ رہا ہے، اگر اس کی بیوی بیٹی اس سے ملتی ہیں، تو اس میں کیا حرج ہے، اس کی تذلیل کرنے کی کیا ضرورت ہے، لہٰذا میں نے یہ کیا، اسی دوران دوبارہ جنرل ضیاء الحق نے پھر مجھ سے کہا کہ آپ کو دوبارہ چیف جسٹس سے ملنا چاہیے، کیوں کہ آپ میری بات نہیں سن رہے اور سزا پر عمل درآمد میں تاخیر کر رہے ہیں، لہٰذا میں دوبارہ چیف جسٹس کے پاس گیا، دوبارہ گورنر سوار خان نے کہا کہ آپ میرا جہاز لے جائیں اور اپنا خیال رکھیں، میں نے کہا کہ اپنا خیال کس لئے رکھوں؟ (ہنستے ہوئے) زندگی میں ایک وقت ایسا آتا ہے، جب آپ کسی چیز کی پروا نہیں کرتے، اس وقت میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

سوال..... جب آپ دوبارہ ملنے گئے، تو چیف جسٹس انوار الحق نے آپ سے کیا کہا؟

ایس کے محمود..... وہی کہ یہ آپ کے لئے بہتر ہوگا، آپ کو جو کہا جائے، وہ کریں، پہلا سوال جو اس نے کیا، وہ یہ تھا کہ اس سزا پر عمل درآمد کی صورت میں عوام کا ردعمل کیا ہوگا؟ میرا جواب یہ تھا کہ یہ بڑا غیر منصفانہ سوال ہے، یہ کام انتظامیہ کا ہے کہ وہ عدالتی فیصلے سے ہونے والے مضر اثرات کو کیسے ہینڈل کرے گی۔

سوال.....کیا قانونی طور پر چیف جسٹس اس طرح بلا کر آپ کو ہدایات دے سکتے تھے؟

ایس کے محمود.....انوار الحق بک چکے تھے، کیا اسے بعد میں 50 ہزار پاؤنڈ نہیں ملے تھے؟

سوال.....کیا یہ پکی بات ہے کہ چیف جسٹس انوار الحق کو حکومت کی طرف سے 50 ہزار پاؤنڈ ملے تھے؟

ایس کے محمود..... میں اس پر کوئی Comment نہیں دینا چاہتا، کیوں کہ مجھے پتا ہے کہ جو میں کہہ رہا ہوں، وہ بغیر کسی ثبوت کے نہیں کہہ رہا، انہیں انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کے لئے 50 ہزار پاؤنڈ ملے، انہوں نے صدارت کا الیکشن لڑا اور انہیں صرف ایک ووٹ مل سکا۔

سوال.....اس بات میں کس حد تک صداقت ہے کہ بھٹو کو پھانسی دینے سے پہلے تشدد کیا گیا، غلام مصطفیٰ کھر اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ بھٹو پر تشدد کیا گیا تھا؟

ایس کے محمود..... جو شخص اس سے سیاسی فائدہ اٹھانا چاہتا تھا، وہ کھر تھے، یہ سب بکواس ہے تشدد یا مار پیٹ کا کوئی واقعہ نہیں ہوا، پھانسی تیسرے دن ہونا تھی، اس دن بارش ہو رہی تھی، لہٰذا میں نے اسے ایک دن کے لئے ملتوی کر دیا۔

سوال.....کیا بارش کی وجہ سے پھانسی ملتوی کر دی گئی تھی۔

ایس کے محمود..... بارش کی وجہ سے پھسلن ہو گئی تھی، پھسلن کی وجہ سے جہاز اڑ نہیں سکتا تھا، کیوں کہ ان کا ارادہ بھٹو کی میت کو جہاز پر لے جانے کا تھا، اسی وجہ سے پھانسی ملتوی کر دی گئی۔

سوال.....کیا بھٹو کو پھانسی دینے کے عمل میں فوجی جرنیل بھی براہ راست شامل تھے؟

یس کے محمود..... سبھی شامل تھے، راحت لطیف اس معاملے میں شامل تھے، جنرل چشتی بھی تھے۔

سوال.....جنرل چشتی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے، پھر جنگ سنڈے میگزین

کے انٹرویو میں انہوں نے کہا کہ میں تو اس موقع پر غائب ہو گیا تھا، کیوں کہ جنرل ضیاء الحق مجھ پر یہ الزام لگانا چاہتا تھا کہ بھٹو کو میں نے مروایا۔

میں آپ کو پھانسی والے دن کی تفصیل بتاتا ہوں۔ اس دن انہوں نے صبح بھٹو کو اٹھایا۔ عام طور پر وہ رات کو ساڑھے بارہ بجے تک جاگتے تھے۔ وہ آخری دن بھی ساڑھے بارہ بجے تک مطالعہ کرتے رہے تھے۔ وہ سوتے وقت دو خواب آور گولیاں لیتے تھے۔ اب ساڑھے بارہ بجے جو بندہ دو گولیاں لے کر سوئے اور ڈھائی بجے آپ اسے اٹھا دیں کہ چلو تیار ہو جاؤ اپنے آخری سفر کے لئے تو ظاہری بات ہے کہ وہ لڑکھڑائے گا۔ وہ نیند میں ہو گا تو میں نے آئی جی جیل خانہ جات سے کہا وہ بھی وہاں موجود تھا۔ میں بہ طور ہوم سیکرٹری سارے معاملے کی مانیٹرنگ کر رہا تھا۔ آئی جی جیل خانہ جات لمحہ بہ لمحہ مجھ سے ہدایات لے رہا تھا۔ جب اس نے بتایا کہ بھٹو صاحب کو چلنے میں تکلیف ہو رہی ہے تو میں نے کہا کہ ٹھیک ہے، ایک اسٹریچر منگوائیں اور اس کے اوپر انہیں لے کر جائیں، کیوں کہ باہر بارش کی وجہ سے پھسلن کافی زیادہ تھی۔ اس کا مقصد انہیں گرنے سے بچانا تھا، کیوں کہ خواب آور گولیوں کے اثر کی وجہ سے وہ سیدھے چل نہیں سکتے تھے، لہٰذا وہ انہیں اسٹریچر پر لٹا کر پھانسی کے لئے لے کر گئے۔ انہوں نے ان کے سر پر پٹی باندھنے کی کوشش کی، جو کہ باندھی جاتی ہے تو بھٹو نے کہا کہ نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے، لیکن پھر بھی انہوں نے باندھی، پھر انہوں نے ان کے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ دیئے، بھٹو نے دوبارہ کہا کہ اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس بات کو دو تین منٹ ہو چکے تھے۔ تارا مسیح جو پھانسی دینے لگا تھا، وہ بھی ایک لمحے کے لئے خوف زدہ ہو گیا تھا کہ جو میں کر رہا ہوں ایک وزیر اعظم کے ساتھ اس کے مجھ پر کیا اثرات ہوں گے تو وہ کچھ دیر کے لئے گھبرا گیا۔ چند الفاظ جو بھٹو نے کہے، وہ یہ تھے۔ وہ پہلے مڑے، پھر انہوں نے کہا

"Get away with it"

یہ ان کے آخری الفاظ تھے یعنی ختم کرو یہ، انہوں نے کہا جو کچھ کرنا ہے فوراً کرو، آپ لوگ مجھے کھڑا کیوں رکھے ہوئے ہو؟

(ایس کے محمود سابق ہوم سیکرٹری پنجاب کے ایک انٹرویو، شائع شدہ 2004ء)

بھٹو پھانسی پر جھول گئے

کرنل رفیع الدین

''حکم کے مطابق بھٹو صاحب کو 3/4 اپریل 1979ء کی درمیانی شب کو دو بجے، انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات کی موجودگی میں پھانسی لگانی تھی۔ انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات چودھری نظیر اختر راولپنڈی جیل میں 3 اپریل صبح سے حاضر تھے، جبکہ وہ یکم اپریل شام سے راولپنڈی آئے ہوئے تھے۔ بھٹو صاحب کو لمبی بھوک ہڑتال، کی وجہ سے ان کی جسمانی حالت دیکھ کر ایک سٹریچر کا بھی بندوبست کر لیا گیا تھا کہ اگر وہ پھانسی گھاٹ تک چل کر نہ جا سکیں تو ان کو اس پر لے جایا جائے گا۔ چند ایک پیٹرومکیسس کا بھی بندوبست کر لیا گیا کیونکہ اس رات آسمان پر کافی بادل موجود تھے اور رات اچھی خاصی اندھیری تھی۔ مندرجہ ذیل افسران رات ایک بج کر پینتیس منٹ پر سیکورٹی وارڈ گئے۔

ا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل چودھری یار محمد

ب۔ کمانڈر سیکورٹی فورس لیفٹیننٹ کرنل رفیع الدین

ج۔ مجسٹریٹ درجہ اول ڈسٹرکٹ کورٹ راولپنڈی مسٹر بشیر احمد خان

د۔ راولپنڈی جیل ڈاکٹر صغیر حسین شاہ

ر۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل خواجہ غلام رسول

جبکہ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹس جیل مجید احمد قریشی، کاظم حسین بلوچ، محابت خان اور

www.bhutto.org

سپرنٹنڈنٹ جیل کے چناؤ کے مطابق چند وارڈرز بھی سیکورٹی وارڈ کے دالان تک مندرجہ بالا پارٹی (ا......ر) کے پیچھے پیچھے گئے۔انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات چودھری نظیر اختر دفتر سے سیدھے موت کے کنویں کی طرف ہی چلے گئے۔ سیکورٹی وارڈ پھانسی گھاٹ اور ان کے درمیانی راستہ پر فوج کی فالتو گارد بھی متعین کر دی گئی تھی۔

مذکورہ پارٹی (ا......ر) بھٹو صاحب کے سیل کے اندر گئی۔ بھٹو صاحب گدے کے اوپر لیٹے ہوئے تھے اور جاگ رہے تھے۔ ان سے مجسٹریٹ مسٹر بشیر احمد خان نے کہا کہ کیا وہ کوئی وصیت چھوڑنا چاہتے ہیں۔ بھٹو صاحب کا رنگ بالکل پھیکا اور زرد پڑ چکا تھا اور وہ جسمانی لحاظ سے نقاہت کی حالت میں تھے۔ ان کی آواز خفیف، بے حد کمزور تھی اور صاف سنائی نہ دے رہی تھی۔ انہوں نے کوشش کر کے کہا۔

" I had.....tried.....but.....my...thougths...were....so...upset....that...I... could not....do..it...I....have...burnt...it"

میں.....نے کوشش..........کی..........

لیکن..........میرے..........خیالات..........

اتنے..........درہم برہم.......... تھے..........کہ میں..........نہ

لکھ..........سکا..........

میں..........نے..........اسے..........جلا دیا۔

میں نے قریب جا کر ان سے کہا کہ جناب آپ چل کر جائیں گے یا یہ آپ کو اٹھا کر لے جائیں۔ انہوں نے مجھے کوئی جواب نہ دیا بلکہ میری آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہے۔ چند لمحوں بعد میں نے اسی فقرے کو دہرایا۔ وہ مجھے اس طرح دیکھتے رہے اور پھر کہا ''مجھے..........افسوس..........ہے''

'' "I.....Pity" '' (انہوں نے کچھ کہا لیکن ہم میں سے کوئی بھی کچھ نہ سمجھ سکا)

میں نے آگے جا کر ان کے اوپر جھک کر کہا۔ معاف کیجئے گا میں آپ کو سمجھ نہیں سکا۔ انہوں نے اسی فقرے کو دہرایا۔ لیکن میں آخری ایک دو لفظ پھر بھی سمجھ نہ پایا۔ میں ان کے چہرے پر پوری طرح جھک گیا اور پھر ان سے کہا معاف کیجئے گا میں آپ کو سمجھ نہیں سکا۔

وہ بے حد کمزوری اور وقفے وقفے کے ساتھ بولے۔

" I....pity...My....wife...left"...

(مجھے..... افسوس .....ہے.....میری.....بیوی.....چلی گئی.....ہے)

وہ بے حد پر اضطرار اور دلسوز حالت تھی۔ میں بھٹو صاحب کے جواب کے ساتھ خاموش ہو گیا۔ شاید وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ وہ چل نہیں سکتے مگر یہ بھی نہیں چاہتے کہ انہیں اٹھا کر لے جائے، شاید وہ یہ سوچ رہے ہوں کہ اگر ان کی بیوی موجود ہوتی تو وہ انہیں سہارا دے کر لے جاتی۔

میں ان کے اس جواب پر بالکل شل اور بے حس ہو گیا۔

مجسٹریٹ نے دوبارہ آگے بڑھ کر ان سے پوچھا کہ آپ کچھ وصیت کرنا چاہتے ہیں۔ بھٹو صاحب خاموش رہے۔ مجسٹریٹ نے دوبارہ پوچھا کہ کیا آپ وصیت لکھوانا چاہیں گے۔ انہوں نے جواب دیا۔

"yes.....I....would.....like...to...dictate"

ہاں.....میں لکھوانا.....چاہوں گا۔

اس لمحے وقت ختم ہو چکا تھا اور جیل سپرنٹنڈنٹ نے ہیڈ وارڈر کو حکم دیا کہ وہ اپنے آدمی اندر لائے اور مسٹر بھٹو کو اٹھا لیں۔ چار وارڈرز اندر داخل ہوئے اور دو نے بھٹو صاحب کے بازو اور دو نے ان کے پاؤں اور ٹانگیں پکڑ کر ان کو اوپر اٹھا لیا جب ان کو اٹھایا تو انہوں نے کہا۔

''مجھے چھوڑ دو'' جب ان کو سیل سے باہر نکالا جا رہا تھا تو ان کی کمر تقریباً فرش کے ساتھ لگ رہی تھی، ان کی قمیض کا پچھلا حصہ ان وارڈروں جو ان کی ٹانگوں کو پکڑے ہوئے تھے، کے پاؤں کے نیچے آیا اور قمیض پھٹنے کی آواز آئی۔ میں نے اس قمیض کا معائنہ تو نہیں کیا لیکن وہ بازوؤں کے نیچے تک ضرور ادھڑ گئی ہو گی یعنی ٹانکے کھل گئے ہوں گے۔ دالان میں ان کو سٹریچر پر ڈال دیا گیا۔ ان کے دونوں ہاتھوں میں ان کے پیٹ کے سامنے ہتھکڑی لگا دی گئی۔ اتنی دیر میں مشقتی عبدالرحمٰن چائے کی پیالی لے کر سامنے آیا جو بھٹو صاحب نے ہمارے داخل ہونے سے پہلے اس سے کہی ہو گی۔ میں یہ سب دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی شان دیکھئے کہ جیل کی دیوار کے پار پرائم منسٹر

ہاؤس میں بھٹو صاحب نے جو بھی چاہا دنیا کے کسی بھی حصے سے ان کیلئے فوراً مہیا کیا گیا اور آج ان کی یہ آخری اور معمولی سی خواہش بھی پوری نہ ہو سکی کہ چائے کی ایک پیالی بھی پی سکیں۔

چاروں وارڈروں نے سٹریچر کو چاروں کونوں سے اٹھالیا۔ بھٹو صاحب نے اپنا سر گردن پر تھامے ہوئے اوپر اٹھائے رکھا مگر ویسے بالکل بے حس رہے۔ ان کے پاؤں پیلے زرد نظر آ رہے تھے جیسے کہ جسم میں خون بالکل کم ہو گیا ہو۔ سیل سے تقریباً دو سو یا دو سو پچاس (250) گز پھانسی گھاٹ تک وہ بالکل خاموش اور بغیر حرکت کے رہے۔ پھانسی کی جگہ وارڈروں نے سٹریچر کو زمین پر رکھا اور دو نے بھٹو صاحب کی بغلوں کے نیچے سے مدد کی اور وہ پھانسی کے تختے پر کھڑے ہو گئے۔ میں بھٹو صاحب کے نزدیک ترین رہا، صرف میں نے اپنے پاؤں پھٹے سے بچا کر رکھے لیکن میرے کان ان کے چہرے سے ایک یا دو فٹ ہی دور رہے ان کے ہاتھوں سے ہتھکڑی نکال کر ان کے بازو اور ہاتھ ان کی کمر کے پیچھے ایک جھٹکے سے لے جائے گئے اور پھر ہتھکڑی لگا دی گئی۔ اسی دوران تارا مسیح نے ان کے سر اور چہرے پر ماسک چڑھا دیا۔ یا تو انہیں چہرے پر ماسک کی وجہ سے سانس لینے میں دقت ہوئی یا ہاتھوں کو مروڑتے ہوئے جب ان کو کمر کے پیچھے ہتھکڑی لگائی گئی تو لوہے کی ہتھکڑی نے ان کی کلائیوں کو دبایا جس کی وجہ سے ان کو تکلیف ہوئی اس لئے انہوں نے کہا "یہ مجھے" شاید وہ کہنا چاہتے ہوں کہ یہ مجھے تکلیف دے رہی ہے۔ میں ان کے بالکل نزدیک تھا یعنی میں تختے سے بچتے ہوئے آگے ان کی طرف اتنا جھکا ہوا تھا کہ ان کے منہ اور میرے کانوں میں ایک دو فٹ کا فاصلہ ہو گا مگر میں ان کی یہ آخری بات پوری نہ سن سکا۔ ٹھیک دو بج کر چار منٹ پر چار اپریل 1979ء کو جلاد نے لیور دبایا اور بھٹو صاحب ایک جھٹکے کے ساتھ پھانسی کے کنویں میں گر پڑے۔ میں اوپر سے سیڑھیوں کے ذریعے اتر کر کنویں کے کھلے رخ نیچے گیا اور دیکھا کہ بھٹو صاحب کا جسم معمولی ہل رہا تھا جو اوپر سے نیچے گرنے کی وجہ سے تھا لیکن وہ اس وقت مردہ حالت میں تھے۔ میں انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات کے پاس ان کرسیوں پر آ کر بیٹھ گیا جو لٹکی ہوئی لاش کے سامنے رکھی ہوئی تھیں۔"

(اقتباس "بھٹو کے آخری 323 دن")

تین ججوں کے ریمارکس
جسٹس سجاد علی شاہ، جسٹس جاوید اقبال، جسٹس نسیم حسن شاہ

تنویر ظہور

ذوالفقار علی بھٹو محض ایک فرد نہیں، ایک انجمن تھے اپنی ذات میں، ایک تحریک کہ جس کا منتہائے مقصود ایک ایسے معاشرے کی بُنتر ہے جو انصاف اور مساوات پر مبنی ہو۔

اس تحریک کا آغاز بھٹو صاحب نے 1967ء میں کیا۔ گو ذوالفقار علی بھٹو کو 4 اپریل 1979ء میں شہید کر دیا گیا مگر یہ تحریک ختم نہیں ہوئی۔ 1971ء میں عظیم پاکستانی قوم کو شہید بھٹو نے ولولۂ تازہ دیا اور اسے ایک طویل ترقی پسندانہ سفر پر ابھارا ایک جابر آمر نے بھٹو صاحب کا سفر ختم کر دیا مگر قوم کا یہ سفر آج بھی جاری ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے پہلے مفکر سیاست دان ہیں جنہوں نے پاکستان کے غریب عوام کو خود آگہی کا سبق اور درس حریت دیا۔ میں نے تین چیف جسٹس صاحبان کی سوانح حیات قلم بند کی تھیں جو شائع ہو چکی ہیں۔

چیف جسٹس آف پاکستان سید سجاد علی شاہ کی ''سچ کیا ہے'' بائیوگرافی جون 1999ء میں شائع ہوئی۔ میں نے ان سے ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے حوالے سے سوال کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ جہاں تک ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کا تعلق ہے تو میں اس بارے میں بتاتا ہوں۔ جب میں سیشن

جج تھا تو ایسے اضلاع میں تعینات رہا ہوں جہاں قتل کی وارداتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ جس کے ایما پر قتل ہوتا ہے، اس کو سزا کم اور جو قتل کرتے ہیں، انہیں زیادہ سزا دی جاتی ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی سزا کے بارے میں اتنا عرض کروں گا کہ سپریم کورٹ کے 9 ججوں پر مشتمل فل کورٹ نے اس مقدمہ کو سنا۔ اس دوران میں جسٹس قیصر علی خان ریٹائر ہو گئے۔ اب آٹھ جج رہ گئے۔ جسٹس وحید الدین کو دماغی فالج ہوا اور وہ اسی بیماری سے وفات پا گئے۔ اب سپریم کورٹ میں کل سات جج رہ گئے جس کے نتیجے میں چار جج، چیف جسٹس شیخ انوار الحق، جسٹس محمد اکرم، جسٹس کرم الٰہی چوہان اور جسٹس تسیم حسن شاہ نے ہائی کورٹ کے فیصلے کو قائم رکھا جبکہ تین جج صاحبان جن میں جسٹس محمد حلیم، جسٹس غلام صفدر شاہ اور جسٹس دراب پٹیل نے ذوالفقار علی بھٹو کو بری کر دیا۔ تین ججوں کی رائے کا اجتراع کرتے ہوئے چار جج یہ فیصلہ کر سکتے تھے سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کر دیتے۔ اس طرح بھٹو صاحب کی زندگی بچ جاتی۔ بہر کیف جو کچھ بھی ہوا، وہ قابل افسوس تھا۔

ہائیکورٹ کے چیف جسٹس اور فرزندِ اقبال جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال کی بائیوگرافی ''دو یادیں'' نومبر 1993ء میں شائع ہوئی۔

بھٹو صاحب کے حوالے سے انہوں نے میرے ایک سوال کے جواب میں کہا..... جب بھٹو صاحب پر قتل کا کیس چلا تو چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین نے مجھ سے کہا کہ آپ بھی اس بنچ میں بیٹھو۔ میں نے جواب دیا کہ اس مقدمے میں بھٹو صاحب کے خلاف قتل کا کیس ہے۔ میں اس لیے بنچ میں بیٹھنا نہیں چاہتا کہ کہیں ان کے دل میں یہ خیال نہ آئے کہ مجھے انہوں نے 1970ء کے الیکشن میں ہرایا تھا اور میں اب انہیں موت تک کی سزا سنا سکتا ہوں۔ میرا جواب سن کر مولوی مشتاق نے مجھے مجبور نہ کیا اور میں اس بنچ میں نہ بیٹھا۔ بہتر ہوتا کہ اس کیس کو عدلیہ میں لانے کی بجائے مارشل لاء کی عدالت سنتی۔ مارشل لاء کے دور میں اس کیس کے عدلیہ میں سنے جانے کے سبب عدلیہ کے وقار کو نقصان پہنچا اور بیرونی دنیا میں یہ تاثر قائم ہوا کہ پاکستان کی عدلیہ آزاد نہیں ہے۔

جس روز بھٹو صاحب کو پھانسی ہونا تھی اس روز اتفاق سے ایک کھانے پر ایسی شخصیات بھی موجود تھیں جن کو علم تھا کہ صبح تین بجے بھٹو صاحب کو سزا دے دی جائے گی۔ وہاں ان کی پھانسی کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔

یہ 4 اپریل کی رات تھی۔ میں کھانے سے واپس آیا۔ رات جب میں سویا میرے اوپر سفید چادر تھی۔ رات تین بجے کے قریب مجھے ایسا محسوس ہوا کہ بھٹو صاحب آئے ہیں۔ انہوں نے میرے اوپر سے چادر اتار کر دور پھینک دی ہے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور ان کا صرف ایک انگریزی کا جملہ سنائی دیا جس کا اردو ترجمہ ہے۔ ''جاوید اقبال.....! یہ دیکھو میرے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔''

شاید رات کھانے میں جو باتیں ہو رہی تھیں اس کا اثر تھا کہ میں نے اس قسم کا خواب دیکھا..... بہرکیف اس قسم کے واقعات کا ذکر محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنی کتاب میں بھی کیا ہے کہ ان کے بعض جاننے والوں کو یہ تجربہ ہوا تو میں اس کا ثبوت دے سکتا ہوں کہ میرے ساتھ واقعی اس قسم کا تجربہ ہوا۔

جسٹس (ر) نسیم حسن شاہ سپریم کورٹ کے اس بنچ میں شامل تھے جس میں بھٹو صاحب کو سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔ جسٹس (ر) نسیم حسن شاہ کی بائیوگرافی ''ایک مصنف'' 1997ء میں شائع ہوئی۔

ذوالفقار علی بھٹو کے کیس کے حوالے سے میرے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا تھا کہ دونوں طرف سے تفصیلی دلائل سامنے لائے گئے۔ آٹھ مہینے تک اپیل کی سماعت ہوتی رہی جو ایک ریکارڈ ہے۔ چار دن بھٹو صاحب خود تشریف لائے اور ذاتی طور پر دلائل پیش کیے..... تین جج صاحبان نے یہ رائے دی کہ ہمارے خیال میں جرم پوری طرح ثابت نہیں ہوا مگر بقایا چار جج صاحبان کی رائے تھی کہ استغاثہ نے جرم ثابت کر دیا ہے۔

عدالتی معرکے سے کہیں زیادہ سیاسی پہلوؤں پر توجہ دی گئی۔ عدالتیں تو مقدمے کے ریکارڈ کو دیکھتی ہیں، اس پہلو پر خاص توجہ نہ دی گئی۔

بھٹو صاحب نے مقدمے کو طول کیوں دیا؟ میں نے تو یہ بات کئی مرتبہ یحییٰ بختیار صاحب سے بھی پوچھی تھی۔ جب سپریم کورٹ میں مقدمہ آیا تو سماعت کرنے والے بنچ میں نو جج تھے۔ دوران سماعت جسٹس قیصر خان اپنی مدت ملازمت پوری ہونے کے بعد ریٹائر ہو گئے۔ مسٹر جسٹس وحید الدین کی صحت اتنی خراب ہوئی کہ وہ سماعت جاری نہ رکھ سکے۔ اس طرح بنچ سات ججوں کا رہ گیا۔

بعدازاں یہ کہا گیا کہ یہ دونوں جج صاحبان بھی بھٹو کے حق میں تھے۔اس طرح نو میں سے پانچ جج انہیں بری قرار دے دیتے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر بھٹو صاحب کے وکلاء کو یہ اندازہ ہو گیا تھا تو انہوں نے مقدمے کو کیوں طول دیا؟ وکلاء صاحبان تو بڑے نبض شناس ہوتے ہیں، وہ ہر جج کے رویے کو بھانپ لیتے ہیں۔اگر بھٹو صاحب یا ان کے وکلاء کو جج صاحبان کی رائے کا اندازہ ہو گیا تھا تو انہوں نے مقدمہ کی کارروائی مختصر کر کے فیصلہ کیوں نہیں لے لیا۔

فیصلہ بھٹو صاحب کے خلاف ہو گیا اور انہیں سخت ترین سزا بھی بھگتنا پڑی اس لیے فطری طور پر ان کے ورثا اور پارٹی کے لوگوں کو رنج پہنچا ہے۔

جسٹس مولوی مشتاق حسین کے بارے میں جسٹس نسیم حسن شاہ کا کہنا تھا کہ بدقسمتی سے ان میں ایک کمزوری تھی۔وہ کسی کے دوست ہوں تو اس قدر کہ اس کا قتل بھی معاف کرنے کو تیار ہو جاتے، اگر وہ کسی کے دشمن ہیں تو کوئی شخص اگر تھوک بھی دے تو اسے سخت سزا دینے سے بھی گریز نہ کرتے۔خاصے انتہا پسند اور غیر متوازن شخصیت کے مالک تھے۔

ایک سابق جج کے انکشافات.....

میاں محمد ارشد سابق سیشن جج

تحریک نظام مصطفےٰ

مارشل لا کے بعد دھاندلی کے واقعات کی جو تفتیش ہوئی اور مقدمات قائم کیے گئے ان سے میرا بھی تعلق اپنی سرکاری پوزیشن میں تھا جب میں محکمہ قانون میں ایڈیشنل سیکرٹری تھا اس کی تفصیل میں بعد میں لکھوں گا لیکن جو Conclusion نکالی گئی اس کے مطابق دھاندلی اس قدر نہیں تھی جس پر تحریک چلائی جانے کا کوئی جواز بن سکتا تھا۔ بلکہ دھاندلی صرف 8-10 Seats میں تھی اور وہ بھی ہر Seat میں چند ایک پولنگ سٹیشنوں پر جبکہ ہر سیٹ کے کم از کم 100 پولنگ اسٹیشن تھے بہر کیف اپوزیشن نے اس چیز کو بنیاد بنا کر ایک زبردست تحریک نظام مصطفےٰ کے نام پر شروع کر دی جس میں کچھ دوسری Demands کو بھی شامل کر لیا گیا۔ مثلاً قادیانیوں کو غیر مسلم Declare کیا جائے۔ جمعہ کی تعطیل کی جائے شراب وغیرہ پر سخت پابندی لگائی جائے۔ ان issues کو شامل کر کے Agitation کی اچھی بھلی بنیاد مل گئی لیکن سب سے بڑا Factor امریکہ تھا۔ جو کسی موقع کی تلاش میں تھا کہ کسی طور پر بھٹو کا اقتدار ختم کیا جائے۔ امریکہ نے بے تحاشا امریکن ڈالر اپوزیشن والوں کو پہنچائے جس کی وجہ سے تحریک زور پکڑتی گئی۔ بھٹو نے راولپنڈی شہر میں نکل کر امریکہ کے خلاف کچھ ثبوت پیش کیے جس پر امریکن سیکرٹری آف سٹیٹ مسٹر کسنجر نے بھٹو سے کہا وہ اسے ایسا سبق سکھائے گا کہ وہ یاد کرے گا۔ بھٹو نے تحریک کو کچلنے کے لئے کئی ایک حربے استعمال کیے لیکن تقریباً سب ناکام رہے۔ اس نے قادیانیوں کے متعلق جمعہ کی چھٹی اور شراب وغیرہ کے متعلق Demands کو تسلیم بھی کر لیا۔ لیکن اس کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ تحریک کا سب سے زیادہ زور لاہور میں تھا بھٹو نے لاہور میں لوکل مارشل لا بھی لگایا۔ لیکن جسٹس اسلم ریاض حسین نے جس کو بھٹو نے ہی نویں

www.bhutto.org

پوزیشن سے اٹھا کر چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ لگایا تھا۔اس کو بھی اس معاملہ میں بھٹو کی مدد کرنے کی جرأت نہ ہوئی بلکہ اس نے مارشل لا کے خلاف فیصلہ دے دیا۔ حالات خراب ہوتے گئے اور بھٹو اپوزیشن سے مذاکرات کرنے کے لئے تیار ہو گیا جس میں دوبارہ الیکشن کرانے کا معاملہ زیرِ غور لانا تھا۔

بھٹو کی پھانسی کی سازش

بھٹو کی رہائی کے بعد جنرل ضیاء الحق کو پریشانی ہو گئی۔اس نے طے کیا کہ بھٹو اگر ہمیشہ کیلئے باہر جانے کے لئے تیار نہ ہو اور کچھ بیانات پر دستخط نہ کر دے تو اس کو زندہ نہ چھوڑا جائے۔اس سلسلے میں ایسے خاص خاص اور متعلقہ لوگوں کو جن کو ذاتی اپنا عناد اور اپنی ذاتی دشمنی بھی تھی ان سے مشورہ کیا گیا۔اس دوران مسٹر جسٹس مولوی مشتاق حسین جو جسٹس اسلم ریاض حسین کے چیف جسٹس بنائے جانے پر ناراضگی میں چھٹی پر باہر چلے گئے تھے وہ واپس آ چکے تھے وہ بھٹو کے خلاف سازش میں شامل ہو گئے۔انہوں نے جنرل ضیاء الحق سے کہا کہ انہیں چیف جسٹس لگا دیا جائے وہ کیس کو اپنی عدالت میں منتقل کر لیں گے اور پھر بھٹو کے خلاف کیس چلا کر انہیں یقیناً پھانسی کا حکم دے دیں گے لیکن اس کی شرط یہ تھی کہ جسٹس شیخ انوار الحق جو چیف جسٹس آف سپریم کورٹ تھے وہ وعدہ کریں کہ وہ بھٹو کی اپیل منظور نہیں ہونے دیں گے اور جنرل ضیاء الحق کسی صورت میں بھٹو کی سزا معاف یا کم نہیں کرینگے۔شیخ انوار الحق کو اپنی بھی کچھ ناراضگی اور عناد تھا (جس کی تفصیل بعد میں دونگا) چنانچہ اس معاہدہ کے تحت جسٹس مولوی مشتاق کو چیف جسٹس بنا دیا گیا۔ چیف جسٹس اسلم ریاض حسین کو گورنر لگا کر ہائی کورٹ سے علیحدہ کر دیا گیا۔جسٹس مولوی مشتاق حسین نے آتے ہی بھٹو کا کیس اپنی عدالت میں منتقل کر لیا۔ضمانت منسوخ کر دی اور ایک اپنی مرضی کے پانچ ججوں کا فل بنچ بنا کر بھٹو کا ٹرائل شروع کر دیا۔ٹرائل کی کارروائی کس طرح ہوئی یہ سب دنیا کو معلوم ہے۔

بھٹو کی قانونی پوزیشن ویسے تو تمام دنیا نے بھٹو کیس کو ایک Judicial Murder کہا ہے۔لیکن اس کیس کے Behind the scene جو واقعات ہوئے اور جن کا میں ذاتی شاہد ہوں وہ میں ضرور تحریر کرنا چاہتا ہوں۔

جنگ عظیم دوم کے وقت مسٹر کرم الٰہی چوہان (جو بعد میں جج بنے) اور ایک مسٹر اقبال قریشی سپلائی کے محکمہ میں کلرک تھے اور سیالکوٹ میں اکٹھی نوکری کرتے تھے۔ 1945ء میں جنگ کے ختم ہونے پر دونوں نوکری سے فارغ ہو گئے۔مسٹر اقبال قریشی تو کسی طرح انگلینڈ چلے گئے اور BOAC میں ملازمت کر لی کرم الٰہی چوہان جن کے والد ایک وکیل کے منشی تھے انہوں نے لا کالج میں داخلہ لے لیا اور

LLB کرنے کے بعد وکالت شروع کر دی۔ وکالت اچھی چل گئی اور ویسے بھی 30-35 سال میں وہ سینئر ایڈووکیٹ ہو گئے اور قسمت نے یاوری کی تو ہائی کورٹ کے جج ہو گئے۔ اس تمام وقفہ میں مسٹر کرم الٰہی چوہان اور مسٹر اقبال قریشی میں پرانی دوستی چلتی رہی۔ مسٹر اقبال قریشی جب کبھی سال دو سال بعد پاکستان آتے تھے وہ اپنے دوست مسٹر کرم الٰہی چوہان کو ضرور ملتے تھے۔ ادھر سے مسٹر کرم الٰہی چوہان ایک دو مرتبہ انگلینڈ گئے تو مسٹر اقبال قریشی کے پاس ہی ٹھہرے۔ مطلب یہ کہ دونوں میں بہت گہری اور بے تکلف دوستی چل رہی تھی۔

مسٹر اقبال قریشی سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ ایک میرے دوست چوہدری محمد ظفر الٰہی بھی سیالکوٹ کے تھے وہ اقبال قریشی کے پڑوسی اور بہت گہرے دوست تھے۔ اقبال قریشی جب کبھی لاہور آتے تھے تو چوہدری ظفر الٰہی کے ساتھ ان کی گاڑی میں گھومتے اور ملنے جلنے جاتے تھے جب وہ کرم الٰہی چوہان کو ملنے جاتے تو وہ چوہدری ظفر الٰہی کے ساتھ جاتے تھے۔ میری مسٹر اقبال قریشی سے ملاقات غالباً 1975ء میں ہوئی تھی جب میں LDA ٹریبونل لاہور کا پریذیڈنٹ تھا۔ پھر میں 1977ء میں محکمہ قانون میں آ گیا۔ اس دوران بلکہ تقریباً 5-7 سال قبل مسٹر کرم الٰہی چوہان ہائی کورٹ کے جج بن چکے تھے۔ جب میں محکمہ قانون میں آیا اور مارشل لا لگ گیا تو چوہدری ظفر الٰہی A.G office میں اکاؤنٹ افسر کے عہدہ سے لیٹرل انٹری Lateral Entry کا امتحان دیکر اسلام آباد میں ڈپٹی سیکرٹری لگے ہوئے تھے۔ وہاں سے ٹرانسفر کروا کر لاہور Rice Milling Corporation میں ڈائریکٹر فنانس لگ گئے تھے۔ اس پوزیشن میں مجھ سے ان کی کافی ملاقات رہتی تھی۔ ایک دو مرتبہ جب وہ مسٹر اقبال قریشی کو لیکر جسٹس کرم الٰہی چوہان کی کوٹھی پر گئے تو مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ جب بھٹو کیس ہائی کورٹ میں شروع ہوا تو چوہان صاحب ہائی کورٹ کے جج تو تھے لیکن اس فل بنچ میں نہیں تھے جو کیس سن رہا تھا۔ ان دنوں مسٹر اقبال قریشی کو پاکستان آنے کا اتفاق ہوا تو As usual ہم تینوں چوہان صاحب کو ملنے ان کی کوٹھی پر گئے۔ ایسے موقع پر وہ دونوں ڈرائینگ روم کے ایک سرے پر بیٹھ جاتے تھے میں اور ظفر الٰہی دوسرے سرے پر۔ البتہ ہمیں ان کی باتیں سنائی دیتی تھیں۔ جیسے میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ وہ آپس میں بہت بے تکلف تھے بلکہ ایک دوسرے کو ہلکا پھلکا گالی گلوچ بھی کر لیتے تھے۔ اس روز مسٹر اقبال قریشی نے گالی دیکر کہا کہ یہ بھٹو کے خلاف کیا ہو رہا ہے۔ چوہان صاحب نے جواب دیا کہ وہ کیس کے Facts سے پوری طرح واقف ہیں اس کیس میں جو مواد اکٹھا کیا گیا ہے اس Basis پر بھٹو کی Conviction کا ایک فی صد بھی کیس نہیں بنتا لیکن میں تمہیں بتاتا

ہوں اس کو پھانسی دینے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ انہوں نے بھی اس سازش یا معاہدہ کا ذکر کیا جو مولوی مشتاق۔ شیخ انوار الحق اور جنرل ضیاء الحق کے درمیان ہوا تھا مسٹر اقبال قریشی نے اس پر بہت افسوس ظاہر کیا۔

جسٹس چوہان کی وضاحت

اتفاق کی بات ہے کہ جب بھٹو کو مولوی مشتاق نے پھانسی کی سزا دی اس وقت تک جسٹس چوہان Elevate ہو کر سپریم کورٹ جا چکے تھے۔ جب اپیل دائر ہوئی اور فل بنچ بنایا گیا تو اس میں جسٹس کرم الٰہی چوہان بھی تھے۔ اور جب بھٹو کی اپیل خارج ہوئی تو چوہان صاحب اس Majority گروپ میں تھے جنہوں نے اپیل مسترد کرنے کا فیصلہ لکھا تھا اور دستخط کیے تھے۔ ابھی بھٹو کو پھانسی نہیں ہوئی تھی کہ اقبال قریشی کا پاکستان میں چکر لگا چنانچہ ہم تینوں پھر چوہان صاحب کو ملنے گئے۔ جاتے ہی اقبال قریشی نے چوہان صاحب کو گالیاں سنانی شروع کیں اور کہا کہ تم نے تو خود کہا تھا کہ بھٹو کے خلاف کیس نہیں بنتا اور اب تم نے خود بھی اسکے خلاف فیصلے پر دستخط کیے ہیں۔ تمہیں شرم نہیں آئی۔ چوہان نے کہا کہ قریشی چھوڑ اس بات کو۔ تمہیں کیا پتہ کہ اسے کیا مجبوری تھی دوسری قسم کے Pressure کے علاوہ اس کو چوہدری ظہور الٰہی کا بھی بہت Pressure تھا جو اسکے سمدھی بن گئے تھے اور عنقریب چوہان کے لڑکے کی شادی ظہور الٰہی کی لڑکی سے ہونے والی تھی۔ مسٹر اقبال قریشی نے بے تکی گالیاں سنائیں۔ مسٹر اقبال قریشی 4-5 سال پہلے B.O.A.C سے ریٹائر ہو گئے تھے اس لئے مسٹر اقبال قریشی سے میرا رابطہ کم ہو گیا۔ ویسے وہ ابھی تک حیات ہیں۔

سپریم کورٹ میں اپیل

جب بھٹو کی کی اپیل سپریم کورٹ میں دائر ہوئی تو چیف جسٹس شیخ انوار الحق نے 9 رکنی بنچ تشکیل دیا۔ اس میں ایک جج جن کا غالباً نام قیصر علی خاں تھا۔ وہ تین مہینے میں ریٹائر ہونے والے تھے۔ انہوں نے چیف جسٹس سے کہا کہ انہیں بنچ میں نہ رکھا جائے کیونکہ وہ ریٹائر ہونے والے ہیں اور اپیل 2-3 ماہ میں فیصلہ پر نہیں پہنچے گی۔ چیف جسٹس نے ان سے کہا نہیں رولز کے مطابق وہ اپیل کے فیصلہ تک Continue کر سکتے ہیں۔ بنچ کے ممبران میں 4 پنجابی تھے۔ یعنی انوار الحق۔ ملک اکرم۔ نسیم حسین شاہ اور کرم الٰہی چوہان، باقی 5 غیر پنجابی تھے جن کے نام قیصر علی خاں۔ صفدر شاہ۔ وحید الدین احمد محمد حلیم اور دراب پٹیل تھے۔ ابتدائی Discussion جو بنچ میں ہوئی اس سے ظاہر ہوا کہ پنجابی جج اپیل خارج کرنے اور غیر پنجابی جج اپیل منظور

کرنے کے حق میں تھے۔ یہ چیز جنرل ضیاء الحق اور پنجابی ججوں کے لئے تشویش ناک تھی۔ مجھے اس طرح پتہ چلا کہ ایک شام میں اپنے دوست عبدالعزیز رندھاوا کے پاس بیٹھا تھا۔ چوہدری ظفر الٰہی اور دو تین دوست اور بیٹھے تھے۔ وہاں پر جسٹس ملک اکرم کے ایک بھانجے جو ٹیلیفون کے محکمہ میں SDO تھے وہ آئے اور انہوں نے بتایا کہ وہ ابھی ابھی ملک اکرم صاحب کے گھر سے ہو کر آئے ہیں وہاں ملک اکرم صاحب بہت پریشان تھے کیونکہ انہوں نے بتایا کہ بھٹو تو بری ہونے والا ہے اور اگر بری ہو گیا تو ہم لوگوں کی خیر نہیں ہو گی۔ بہر کیف اپیل کی Hearing کے دوران بھی پتہ چلنے لگا کہ Majority اپیل منظور کئے جانے کے حق میں معلوم ہوتی تھی۔

اس پریشان صورتحال سے نمٹنے کیلئے طے یہ ہوا کہ دو یا کم از کم ایک غیر پنجابی جج کو توڑا جائے۔ اس کا طریقہ یہ نکالا گیا کہ جسٹس قیصر علی خاں جو ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچ گئے تھے اور اس اپیل کے اختتام تک رکھے گئے تھے ان کو ریٹائر کر دیا گیا۔ لہٰذا اب معاملہ برابر برابر ہو گیا چار پنجابی جج ایک طرف اور غیر پنجابی جج ایک طرف اور اس سے اطمینان تو ہوا کیونکہ اگر جج برابر ہوں اور Majority اپیل منظور ہونے کے حق میں نہ ہو۔ تو اپیل خارج کی جاتی ہے۔ لیکن جب جنرل ضیاء الحق کو تسلی دلانے کی کوشش کی گئی تو انہوں نے کہا کہ یہ کافی نہیں ہے۔ کیونکہ اپیل خارج ہونے کے بعد ایک رحم کی اپیل اس کے پاس آئیگی تو اگر جج برابر برابر رہے تو اس کے لئے مشکل ہو گا کہ پھانسی کی سزا کو ختم نہ کر سکے۔ پھانسی کا حکم برقرار رکھنے کے لئے اسے Majority فیصلہ ضروری چاہیے۔

جسٹس صفدہ شاہ پر دباؤ

سپریم کورٹ کی Hearing کے دوران سب سے Vocal جج جو سزا کے خلاف تھا وہ جسٹس صفدہ شاہ تھا اس لئے اس پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ جسٹس صفدر شاہ کا اگر کوئی قریبی عزیز راولپنڈی میں تھا جس کے گھر جج صاحب آیا جایا کرتے تھے تو وہ مسٹر نصر من اللہ سی ایس پی تھے جس کی بیوی جج صاحب کی بھانجی تھی۔ جس سے جج صاحب کو بہت پیار تھا۔ چنانچہ نصر صاحب کی مدد حاصل کرنے کی کوشش شروع ہوئی۔ نصر صاحب مارشل لاء کے وقت بلوچستان کے چیف سیکرٹری تھے ان کو ہٹا کر کھڈے لائن لگا دیا گیا تھا۔ یعنی Rice Milling Corporation کا چیئرمین لگا دیا گیا جو ختم تو ہو چکی تھی۔ لیکن اسکی Winding up کی کارروائی ہو رہی تھی پرانے رائس یونٹ جو قومیائے گئے تھے ان کو مالکان کو واپس کرنے کا کام ہو رہا تھا۔ اس کارپوریشن کا دفتر گارڈن ٹاؤن لاہور کی ایک کوٹھی میں تھا اس کوٹھی کی اوپر کی منزل میں دو رہائشی

Suite بنوائے ہوئے تھے۔ تا کہ جب نصر صاحب لاہور میں ہوں تو وہ اپنے دفتر کے اوپر ہی قیام کر سکیں۔

مندرجہ بالا تفصیل مجھے اس لئے معلوم ہے کہ میرے وہ قریبی دوست چوہدری ظفر الٰہی جو فیڈرل گورنمنٹ میں ڈپٹی سیکرٹری تھے اور ان دنوں اسی رائس ملنگ کارپوریشن میں جس کے نصر صاحب چیئرمین تھے ڈائریکٹر فنانس لگے ہوئے تھے۔ ان دنوں کارپوریشن میں کام تو زیادہ نہیں تھا۔ خاص طور پر چیئرمین تو زیادہ تر فارغ ہی رہتے تھے اس لئے وہ تقریباً روزانہ چوہدری ظفر الٰہی کو بلا کر گپ شپ لگاتے رہتے تھے۔ انہوں نے ہی چوہدری ظفر الٰہی کو بتایا تھا کہ انہیں نہ صرف بلوچستان کے چیف سیکرٹری کی پوسٹ سے ہٹا کر کھڈے لائن لگا دیا گیا بلکہ انہیں چارج شیٹ بھی دی گئی۔ جس میں سب سے بڑا چارج تو یہ تھا کہ بطور چیف سیکرٹری بلوچستان وہ بھٹو کو خفیہ طور پر بلوچستان کے سیاسی حالات سے آگاہ کرتے رہتے تھے اور جو اقدامات وہاں کرتے تھے وہ بھٹو کے کہنے پر کرتے تھے۔ نصر نے بتایا کہ اس چارج کا جواب اس نے یہ دیا تھا کہ "What else is the Chief Secretary Supposed to do" یعنی چیف سیکرٹری کی اور ڈیوٹی کیا ہوتی ہے۔ وہ فیڈرل گورنمنٹ کا نمائندہ ہوتا ہے اور اس کا اہم کام یہی ہوتا ہے کہ سیاسی حالات سے فیڈرل گورنمنٹ یعنی وزیراعظم کو آگاہ کرتا رہے۔ نصر صاحب یہ سب باتیں چوہدری ظفر الٰہی کو بتا دیا کرتے تھے اور اس طرح یہ باتیں میرے تک پہنچ جاتی تھیں بلکہ روز کے روز پتہ لگتا رہتا تھا۔

جسٹس مولوی مشتاق کی دلچسپی اور پیشکش

جب مسئلہ جسٹس صفدر شاہ کو Win Over کرنے کا تھا تو نصر صاحب سے قریبی رشتہ داری کی وجہ سے رابطہ کرنے کا پروگرام بنا۔ اس تمام عمل میں جسٹس مولوی مشتاق حسین بھی پوری دلچسپی لے رہے تھے اور تمام سازشی میٹنگز میں شامل ہوتے تھے ان کو شاید سب سے زیادہ خطرہ محسوس ہوتا تھا کیونکہ اگر یہ ثابت بھی ہو گیا تھا کہ بھٹو کی سازش سے نواب محمد احمد کو قتل کیا گیا تھا تب بھی اسے زیادہ سے زیادہ عمر قید کی سزا ہو سکتی تھی۔ ایسے Cases میں آخری سزا صرف اُسے ہی دی جا سکتی ہے جس نے خود اپنے ہاتھ سے کسی کو قتل کیا ہو۔ جس نے سازش کی ہو یا جس میں کسی Behind the scene کام کرنے والے کو پھانسی کا حکم ہوا ہو۔ مولوی مشتاق کو پتہ تھا کہ اسکا پھانسی کی سزا دینے کا فیصلہ بالکل غلط اور غیر قانونی تھا اس لئے اگر بھٹو بچ گیا یعنی زندہ رہ گیا تو سب سے پہلے وہ اس کی جان لیگا۔ چنانچہ اس نے خود پیشکش کی کہ وہ نصر صاحب سے بات کریگا۔ لہٰذا ایک روز مجھے میرے دوست چوہدری ظفر الٰہی نے بتایا کہ آج دفتر میں وہ نصر صاحب

کے سامنے بیٹھے تھے تو انہیں مولوی مشتاق کا ٹیلیفون آیا۔ مولوی نے پہلے تو حال احوال پوچھا۔ نصر صاحب پہلے تو حیران ہوئے لیکن اخلاقاً جواب دیتے رہے۔ پھر مولوی مشتاق نے کہا کہ نصر صاحب آپ کہاں کھڈے لائن پڑے ہوئے ہیں۔ کسی اچھی جگہ لگنا چاہیے۔ انہوں نے جواب دیا کہ وہ حالات کا شکار ہوئے ہیں۔ کہنے لگا کہ نہیں اگر آپ کہیں تو میں آپکو چیف سیکرٹری سرحد لگوا سکتا ہوں مجھے آپ سے ہمدردی ہے اس پر نصر صاحب کو غصہ آ گیا۔ انہوں نے مولوی سے پوچھا کہ آپ میرے ہمدرد کب سے ہو گئے ہیں۔ میرے چارج شیٹ کی نوک پلک تو تم نے درست کی تھی۔ یعنی قانونی Vetting کی تھی جس کا ثبوت میرے پاس اس Draft کی فوٹو کاپی موجود ہے جس میں تمہارے ہاتھ کی کی ہوئی تبدیلیاں یا Corrections موجود ہیں۔ دراصل نصر من اللہ کیونکہ ایک سینئر CSP تھا اسکے کسی جونیئر نے جو اس کارروائی والے Cell میں کام کر رہا تھا اس نے اس Draft کی فوٹو کاپی کروا کر نصر کو پہنچا دی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ کون کون لوگ یہ کام کروا رہے ہیں۔ نصر نے یہ Draft سابق چیف جسٹس سردار محمد اقبال کو بھی دکھایا تھا کیونکہ چارج شیٹ کا جواب نصر صاحب نے سردار صاحب سے تیار کروایا تھا۔ مولوی مشتاق نصر صاحب کا جواب سن کر سٹپٹا گیا اور بہانے کرنے لگا کہ نہیں اس وقت حالات کچھ اور تھے اور اسے جنرل ضیاء کے حکم سے چارج شیٹ کو قانونی لحاظ سے دیکھنے کا حکم ملا تھا۔ نصر صاحب نے آخری وار یہ کیا کہ مولوی سے پوچھا کہ اچھا یہ بتاؤ کس حیثیت سے اور کس اتھارٹی سے تم مجھے چیف سکرٹری سرحد لگوا رہے ہو۔ اس پر مولوی نے ٹیلیفون بند کر دیا۔

اس روز چوہدری ظفر الٰہی نے یہ تمام واقعہ مجھے بتایا انہوں نے بتایا کہ زیادہ باتیں تو وہ خود بھی سن رہے تھے لیکن فون کے بعد نصر صاحب نے سب کچھ Repeat کیا اور پوری بات چیت ان کو بتائی۔ ساتھ ہی ساتھ نصر صاحب نے اس کی Background بھی بتائی کہ جسٹس صفدر شاہ اسکی بیوی کے ماموں ہیں اس لئے جج صاحب تک پہنچنے کیلئے وہ مجھے لالچ دیکر بیچ میں لانا چاہتے ہیں گو یہ بڑی بھونڈی سی کوشش ہے۔ نصر صاحب نے بتایا کہ وہ خود تو صفدر شاہ سے بات کیا کرتے اس کی بیوی بھی ان سے اس قسم کی بات کرنے سے ڈرتی تھی۔

جسٹس انوار الحق کی کوشش

مولوی مشتاق والے واقعہ کو ابھی چند دن ہی ہوئے تھے کہ ایک روز چوہدری ظفر الٰہی نے مجھے بتایا کہ میاں صاحب آج نیا واقعہ ہوا ہے۔ چوہدری ظفر الٰہی اس روز بھی نصر صاحب کے سامنے بیٹھے تھے

کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔نصر صاحب نے ٹیلیفون اٹھایا تو P.A نے بتایا کہ صدر پاکستان کا ٹیلیفون ہے۔ مجھے سمجھ آ گئی تو میں اٹھکر جانے لگا تا کہ نصر صاحب علیحدگی میں بات کر سکیں۔نصر صاحب نے مجھے روک دیا اور فون پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے بیٹھے رہو۔ مجھے سمجھ ہے کہ یہ کس کا ٹیلیفون آیا ہے۔ یہ فون جسٹس انوار الحق صاحب کا ہے جو جنرل ضیاء الحق کی جگہ صدر کی کرسی پر بیٹھے ہیں کیونکہ جنرل صاحب عمرہ پر گئے ہوئے ہیں چوہدری ظفر الٰہی بیٹھے اور پوری بات چیت سنتے رہے۔جسٹس انوار الحق چونکہ I.C.S تھے اور اس وقت سب سے سینئر سول سروس کے ممبر تھے اس لئے نصر صاحب کا لہجہ بڑا مودبانہ تھا۔جسٹس انوار الحق نے حال احوال پوچھنے کے بعد کہا کہ نصر! تم آجکل اچھی پوسٹ پر نہیں ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں کوئی اچھی Assignment مل جائے کیا تم چیف سیکرٹری فرنٹیر لگنا پسند کرو گے۔نصر صاحب نے جواب دیا کہ نہیں سر! میں آجکل Hot water میں ہوں اور موجودہ حالات میں یہیں ٹھیک ہوں۔انوار الحق نے کہا کہ تم فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائیگا۔ ویسے اگر تمہیں صوبہ سرحد پسند نہیں تو صوبہ پنجاب میں لگوا سکتا ہوں۔نصر صاحب نے پھر معذرت کی جس پر انوار الحق نے کہا کہ تم بیوقوف مت بنو۔کل میرے پاس اسلام آباد آؤ اور ڈنر میرے ساتھ کرو۔نصر صاحب نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں حاضر ہو جاؤنگا۔

اسلام آباد سے واپسی پر نصر صاحب نے پوری روداد چوہدری ظفر الٰہی کو بتائی کہا کہ انوار الحق نے بڑے پیار محبت سے ڈنر پر باتیں کیں اور پھر مدعا بیان کیا کہ نصر! ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ بھٹو ایک زہریلا سانپ ہے جس کو ختم کرنا ملک وقوم کے مفاد میں ہے۔اسکی اپیل سپریم کورٹ میں پڑی ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ جسٹس صفدر شاہ صاحب ہمارے ساتھ تعاون کریں۔آپ اور آپکی بیگم ان سے بات کریں۔نصر صاحب نے جواب میں کہا! سر آپکا حکم بجالانا ہمارے لئے قابل فخر ہے لیکن جس قسم کی جج صاحب کی طبیعت ہے ہم ان سے بات کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ہم نے خدا کی قسم ہے کبھی ان سے کسی مقدمے کی بات نہیں کی اور نہ اب کر سکتے ہیں۔نصر صاحب نے آخر میں یہ کہا کہ سر! جسٹس صفدر صاحب تو آپکے جونیئر ہیں آپ خود براہ راست ان سے یہ بات کیوں نہیں کرتے۔کہنے لگے کہ بھئی میری ایک مرتبہ اس موضوع پر بات ہوئی ہے۔لیکن وہ یہ بتاتے ہیں کہ جتنا مجھے بھٹو ناپسند اور برا لگتا ہے اور جتنا مجھے اسکے خلاف غصہ اور عناد ہے اور کسی جج کو ہو نہیں سکتا۔ایک تو یہ کہ اس نے اپنے مفاد میں ایک ایسی آئینی ترمیم کی جس سے مجھے چیف جسٹس پشاور ہائی کورٹ سے بننا پڑا اور مجھے سپریم کورٹ کے جج کی Option دینے پر مجبور ہونا پڑا۔دوسرے یہ کہ میرے ساتھ دو تین مرتبہ بھٹو نے سخت بدتمیزی کی ایک دفعہ

جب وہ چیف جسٹس پشاور تھے تو بھٹو نے ٹیلیفون کیا اور کہا کہ فلاں معاملہ میں فیڈرل گورنمنٹ کی پوزیشن بڑی نازک ہے اس لئے اگر وہ کیس ہمارے خلاف ہو گیا تو ہمیں نا قابل تلافی نقصان ہوگا۔ اس لئے آپ خیال رکھیں۔ جج صاحب کو غصہ آیا اور انہوں نے جواب دیا۔

"Mr. Prime Minister! You should be the last man to talk to me in a case pending in the Court . If Federal Government is so much interested, it is for the Attorney General to bring to our notice according to law, the problems that you are likely to face and convince us that you have a valid case in your favour"

اس کے جواب میں بھٹو نے بدتمیزی کی اور کہا کہ شاہ صاحب رہنے دیں میں سب جانتا ہوں آپ لوگ کس طرح کام کرتے ہیں اور کیا کیا مفاد اٹھاتے ہیں اور کیسے کیسے سفارشوں یا کسی اور وجہ سے فیصلے کرتے ہیں۔ یہ سن کر جج صاحب نے بھی کچھ سختی کے الفاظ کہے۔ پھر یکدم بھٹو نے اپنا لہجہ درست کیا اور کہا کہ نہیں جج صاحب! آپ خواہ مخواہ ناراض ہو گئے۔ میرا مطلب کوئی آپکے کردار پر الزام لگانا نہ تھا۔ اگر میں نے کوئی غلط الفاظ استعمال کئے ہیں تو معذرت قبول کریں۔

ایک دوسرا واقعہ جو جسٹس صفدر شاہ نے بتایا وہ یہ تھا کہ چیف جسٹس حمود الرحمٰن نے Law Reforms Commission کی رپورٹ پیش کی تو بھٹو نے ایک ڈنر Arrange کیا جس پر انہیں اور کچھ دیگر ججوں اور وزراء حضرات کو دعوت دی۔ اس دعوت پر بھی جب میز پر ایک طرف بھٹو اور اس کے وزراء بیٹھے تھے اور بالمقابل چیف جسٹس حمود الرحمٰن اور دیگر کچھ جج بیٹھے تھے جن میں صفدر شاہ بھی تھے۔ اس کھانے کے دوران باتیں کرتے کرتے بھٹو نے جوڈیشری کے متعلق یا کچھ ججوں کے متعلق کوئی غلط الفاظ استعمال کر دیئے۔ اس کا ججوں نے برا منایا خاص طور پر جسٹس صفدر شاہ نے بھٹو کو کچھ سختی سے جواب دیئے۔ نتیجتاً کچھ تلخ کلامی ہوئی۔ اچھا خاصا شور ہونے لگا تو جسٹس حمود الرحمٰن نے موقعہ کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے بیچ بچاؤ کیا اور معاملہ کو گول کر دیا۔ لیکن بدمزگی بہت ہوئی اور بھٹو کی بدتمیزی اور بدکلامی سے تمام ججوں کے دل خراب ہوئے خاص طور پر جسٹس صفدر شاہ صاحب کے دل میں بھٹو کے خلاف بہت نفرت پیدا ہو گئی۔

اس قسم کے وہ واقعات سنانے کے بعد جسٹس صفدر شاہ نے انوار الحق سے کہا کہ مجھے بھی ذاتی طور پر بھٹو زہریلا سانپ لگتا ہے لیکن بطور جج میں یہ نہیں دیکھتا کہ میرے سامنے ملزم کون ہے میں صرف ثبوت دیکھتا ہوں۔ آپ لوگ مجھے واقعات اور قانون سے قائل کریں تو میں آپکے ساتھ ہوں لیکن صرف اس وجہ سے کہ ملزم بہت برا ہے میں اس کو کبھی سزا نہیں دے سکتا جب تک شہادت اور قانون اسکے جرم کو

ثابت نہیں کرتا۔

جسٹس انوار الحق نے جسٹس صفدر شاہ کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ Convince نہ ہوئے اور نہ ہی انہوں نے اپنے خیالات کو تبدیل کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ لہٰذا جسٹس انوار الحق نے نصر صاحب سے کہا کہ میں نے یہ مناسب سمجھا ہے کہ یہ ایک کوشش نصر صاحب اور انکی بیگم کے ذریعے کی جائے کیونکہ جج صاحب اپنی بھانجی کی بات ضرور مانتے ہیں۔ لیکن نصر صاحب نے معذرت کی اور انوار الحق سے اجازت لیکر واپس لاہور آ گئے۔

یہ واقعہ نصر صاحب نے چوہدری ظفر الٰہی کو بتایا اور کہا کہ اسے بہت افسوس ہے کہ پاکستان کی جوڈیشری زیادہ تر جنرل ضیاء الحق کے آلۂ کار بنی ہوئی ہے اور خاص طور پر ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے پنجابی جج ایسی گھٹیا اور غیر قانونی حرکات کر رہے ہیں کہ فوجی بھی نہیں کرتے۔ ایسے لوگ ایک قسم کا عدالتی نہیں بلکہ سیاسی کردار ادا کر رہے ہیں اور بھٹو کو پھانسی دلانے میں پیش پیش ہیں۔

چوہدری ظفر الٰہی کے پوچھنے پر نصر صاحب نے انہیں بتایا کہ جسٹس انوار الحق کو کئی ایک واقعات کی وجہ سے بھٹو سے سخت نفرت تھی۔ دو تین مرتبہ بھٹو نے انوار الحق کی کافی بے عزتی کی تھی۔ ایک واقعہ یہ بھی تھا کہ جسٹس انوار الحق Pay Commission کے سربراہ تھے۔ انہوں نے جب کمیشن کی طرف سے تیار کی گئی رپورٹ بھٹو کو پیش کی تو اس نے سب سے پہلے آخری ایک دو صفحات جن میں کمیشن نے اپنی Conclusions لکھی تھیں اور اپنی سفارشات پر جتنی رقم درکار تھی وہ تفصیل دی ہوئی تھی۔ ان کو پڑھا وہ آگ بگولا ہو گیا۔ رپورٹ انوار الحق کی طرف پھینکی اور کہا "اتنی رقم تمہارا باپ دیگا" یعنی ملازمین اور پنشنرز کے لئے جو تجویزیں دی گئی تھیں اس کی Financial implications کا جو تخمینا درج تھا وہ بہت زیادہ تھا۔ بھٹو نے اس کی نشاندھی کرتے ہوئے رپورٹ پھینکی تھی۔ ظاہر ہے یہ اتنی بے عزتی تھی کہ انوار الحق برداشت نہ کر سکا منہ سے تو کچھ نہ بولا لیکن غصہ میں اٹھا اور کمرے سے جانے لگا۔ اس پر بھٹو نے محسوس کیا کہ اس نے زیادتی کی ہے۔ لہٰذا اس نے انوار الحق کو پکڑ کر واپس لانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ رکے اور چلے گئے۔ کچھ اور واقعات بھی ہوئے تھے جس کی وجہ سے انوار الحق کو بھٹو کے خلاف سخت Grudge تھا اس کے علاوہ جو بھٹو کو پھانسی لگانے کی سازش ہوئی تھی اس میں ضیاء الحق اور مولوی مشتاق حسین کے ساتھ تیسرا شخص انوار الحق تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ بھٹو کی اپیل سپریم کورٹ میں خارج ضرور ہونی چاہیے۔ اس لئے وہ سب کچھ کر رہا تھا۔ دیگر تین پنجابی ججوں کو بھی کچھ نہ کچھ Grievance بھٹو کے خلاف تھا۔ کرم الٰہی چوہان تو چوہدری

ظہور الٰہی کے مجبور کرنے پر ساتھ دے رہا تھا کیونکہ وہ دونوں آپس میں سمدھی تھے۔ کرم الٰہی چوہان کے لڑکے کی منگنی چوہدری ظہور الٰہی کی لڑکی سے ہو چکی تھی۔

جب جنرل ضیاء الحق اور اس کے آلۂ کار سپریم کورٹ کے پنجابی جج جسٹس صفدر شاہ کو ساتھ ملانے میں ناکام رہے تو پھر ایک نئی سکیم بنائی گئی۔ جسٹس وحید الدین بیماری کی وجہ سے کراچی ہسپتال داخل تھے اور ان کا 2-3 ماہ سے قبل ٹھیک ہونا مشکل لگتا تھا۔ تو وہ گھر منتقل ہو گئے تھے۔ اور گھر پر ہی علاج ہو رہا تھا ان کے متعلق ڈاکٹری رپورٹ بنوا کر ان کو قبل از وقت ریٹائر کر دیا گیا۔ حالانکہ یہ فیصلہ خود صدر صاحب نہیں کر سکتے تھے اور یہ اختیار صرف سپریم کورٹ جوڈیشل کونسل کو ہی تھا۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ اپیل کا فیصلہ 4-3 کی Majority سے بھٹو کے خلاف کر دیا گیا۔

جوڈیشل قتل

اپیل خارج ہونے کے بعد جو Review درخواست پیش ہوئی وہ بھی سپریم کورٹ نے خارج کر دی اور جنرل ضیاء الحق نے بھٹو کی پھانسی کے حکم کے خلاف رحم کی اپیل بھی خارج کر دی یہ اپیل بھٹو نے نہیں کی تھی اور نہ ہی اس نے اس Stage پر بھی کسی قسم کی معافی مانگی تھی سنا تھا کہ اسے چند بیانات پر دستخط کرنے اور ملک سے ہمیشہ کے لئے باہر جانے کا مشورہ دیا گیا۔ لیکن بھٹو نے انکار کر دیا اور بالآخر تختہ دار پر چڑھ گیا۔ دنیا نے اس کو Judicial Murder کا نام دیا۔ PID کی وہ Volume جس میں سپریم کورٹ کا فیصلہ چھپا تھا اس کو کوئی عدالت دیکھنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اگر کوئی وکیل اس کا حوالہ دینا چاہتا ہے تو اسے کہہ دیا جاتا ہے کہ اس کو علیحدہ رکھ دو یہ فیصلہ Quote نہیں کیا جا سکتا۔ اب تو جسٹس نسیم حسن شاہ نے بھی ایک دو مرتبہ بیان دیئے ہیں کہ بھٹو کو پھانسی کا حکم قانونی طور پر ضرور غلط تھا اور اپیل میں تبدیل ہونا چاہیے تھا لیکن یحییٰ بختیار کی غلطی سے نہ ہو سکا۔ لوگ کہتے ہیں کہ واقعی کہ اگر اسکی کوئی غلطی تھی بھی تو عدالت تو صحیح فیصلہ کر سکتی تھی کسی وکیل کی غلطی کی وجہ سے موکل کو تو سزا نہیں ملنی چاہیے اگر ہائی کورٹ کا فیصلہ واقعی غلط تھا تو اپیل میں سپریم کورٹ کا اسے ٹھیک نہ کرنا صریحاً انصاف کا خون تھا لیکن اس وقت تو سب کچھ ایک سازش کے تحت ہو رہا تھا قانون کے مطابق نہیں۔

تھوڑا ہی عرصہ پہلے سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس سید نسیم حسن شاہ نے ایک نجی ٹیلی ویژن پر انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ بھٹو کے وکلاء نے ان کا کیس صحیح طور پر نہیں لڑا اور وہ صحیح انداز میں اسکی

پیروی کرتے تو بھٹو کو پھانسی سے بچایا جا سکتا تھا۔ اس کے واضح معنی یہ تھے کہ بھٹو کا ''جرم'' پھانسی والا نہیں تھا، انہیں کم سزا دی جا سکتی تھی یا بری بھی کیا جا سکتا تھا مگر یہ کہ ان کے کیس کی پیروی درست سمت میں نہیں کی گئی۔ اس کے مزید معنی یہ تھے کہ جسٹس نسیم حسن شاہ دل میں سمجھتے تھے کہ یہ پھانسی کا کیس نہیں بنتا وہ صفائی کے وکلاء کے دلائل کا سہارا لینے کی بجائے از خود قانونی سطح پر بھٹو کیلئے پھانسی کا فیصلہ لکھنے سے گریز کر سکتے تھے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا! یہی وہ نکتہ ہے جس نے اس کیس کے فیصلے کو قانونی اور عدالتی حلقوں کیلئے مستند نہیں رہنے دیا۔ اس کی کچھ اہم تفصیل اور ایسی باتیں یہاں درج کی جا رہی ہیں جو شاید اس انداز سے پہلے سامنے نہ آئی ہوں مگر اس بات کا ذکر بھی یہاں ضروری ہے کہ جسٹس نسیم حسن شاہ نے یہ بات پہلی بار نہیں کہی تھی کہ بھٹو کا ''جرم'' پھانسی کا ''مستحق'' نہیں تھا۔ جسٹس نسیم حسن شاہ یہ بات زیادہ کھل کر نو سال پہلے بھی انٹرویو میں کر چکے تھے۔ ان کا لاہور کے ایک اخبار میں 23 اگست 1996ء کو ایک تفصیلی انٹرویو چھپا تھا اس میں انہوں نے بالکل صاف الفاظ میں کہا کہ ''بھٹو پھانسی کے پھندے سے بچ سکتے تھے انہیں کم سزا ہو سکتی تھی اس بارے میں ان کا کیس بہت مضبوط تھا میں نے ان کے وکیل صفائی یحییٰ بختیار کو سمجھایا بھی تھا کہ وہ میرے بتائے ہوئے نکات کے مطابق دلائل دے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا غالباً وہ کم سزا کی بجائے مکمل بریت کے خواہاں تھے۔

یہاں کسی مزید تفصیل میں جائے بغیر مختصر حوالہ دینا ضروری ہے کہ بھٹو کیس ابتداء میں ایک سول کورٹ میں زیر سماعت تھا اسے لاہور ہائی کورٹ کے قائم مقام چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین نے از خود براہ راست ہائی کورٹ میں اور خاص طور پر اپنی عدالت میں منتقل کر لیا تھا۔ مولوی مشتاق کو رنج تھا کہ بھٹو کی حکومت کے دور میں دو بار ان کی سنیارٹی کو نظر انداز کر کے دو جونیئر ججوں کو باری باری چیف جسٹس بنا دیا گیا تھا۔ ان میں سے جسٹس اسلم ریاض حسین کو تو نویں نمبر سے اوپر لایا گیا تھا۔ جسٹس مولوی مشتاق حسین نے بھٹو کے اس سلوک پر غضبناک ہو کر ایک بار کہا تھا کہ ''میں اسے دیکھ لوں گا'' اس کے بعد جسٹس مشتاق حسین نے عدالت میں آنا تقریباً بند کر دیا تھا۔ وہ عدالت میں آتے تو چیمبر میں بیٹھے رہتے اور کوئی کام نہ کرتے یا پھر بیرون ملک چلے جاتے۔ وہ اس وقت بھی بیرون ملک تھے جب 5 جولائی 77ء کو جنرل ضیاء الحق نے ملک میں مارشل لاء نافذ کیا اور فوری طور پر مولوی مشتاق کو واپس آنے کو کہا۔ مارشل لاء کے نفاذ کے فوری بعد چاروں صوبوں کے ہائی کورٹوں کے چیف جسٹس حضرات کو قائم مقام گورنر بنا دیا گیا۔ لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اسلم ریاض حسین کو بھی قائم مقام گورنر بنا دیا گیا۔ ان کی جگہ 12 جولائی

77ء کو مولوی مشتاق حسین کو قائم مقام چیف جسٹس بنا دیا گیا۔ انہوں نے فوری طور پر ماتحت عدالت سے بھٹو کیس کو اپنے پاس طلب کر لیا۔ اس سے پہلے روز جسٹس صمدانی اور جسٹس مظہر الحق پر مشتمل ڈویژن بنچ مسٹر بھٹو کو ضمانت پر رہا کر چکا تھا۔ بھٹو کو دوبارہ گرفتار کر کے مولوی مشتاق کے تشکیل کردہ پانچ رکنی بنچ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اس بنچ نے بھٹو کے خلاف نواب محمد احمد خاں قتل کیس کی سماعت شروع کر دی۔ اس کیس کی ابتداء اور سماعت کی تفصیلات بار بار چھپ چکی ہیں یہاں صرف دو اہم نکات کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس کیس کی سماعت کے مکمل ہو جانے کے بعد مولوی مشتاق حسین نے اس وقت فیصلہ نہیں سنایا جب تک انہیں چیف جسٹس کے عہدہ پر مستقل نہیں کر دیا گیا۔ دوسری اہم بات یہ کہ جن دنوں سپریم کورٹ میں بھٹو کیس کی اپیل کی سماعت ہو رہی تھی ان دنوں پنجاب میں مقبول الٰہی ملک ایڈووکیٹ جنرل تھے۔ مارشل لاء کی حکومت نے بھٹو کے خلاف استغاثہ کے وکیلوں کی جو ٹیم تیار کی اس میں مقبول الٰہی کو شامل نہیں کیا گیا۔ اصولی طور پر ایڈووکیٹ جنرل کی حیثیت سے انہیں اس مقدمہ کا پراسیکیوٹر بنایا جانا چاہیے تھا مگر انہیں نظر انداز کیا گیا تھا۔ وہ ہر بار معنی خیز انداز میں مسکرا کر رہ گئے۔ ایم انور ایڈووکیٹ چوہدری ظہور الٰہی (مرحوم) کے قریبی دوست اور ان کے ادارے پی پی ایل (پاکستان ٹائمز امروز) کے لیگل ایڈوائزر بھی تھے۔ پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں چوہدری ظہور الٰہی (مرحوم) کے ساتھ بار بار تذلیل آمیز سلوک کیا گیا۔ اس کے ایم انور چشم دید گواہ تھے۔ انہیں ایک یہ رنج بھی تھا کہ ان کے بھائی کیپٹن سرور شہید کی بیوہ ریحانہ سرور پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئی تھیں اور اب ایم انور سے ان کے خاندان سے اپنے خاوند کی جائیداد میں سے حصہ مانگ رہی تھیں۔ ان وجوہ کی بنا پر ایم انور پیپلز پارٹی کے سخت مخالف ہو چکے تھے۔ انہیں بھٹو کیس کا پراسیکیوٹر مقرر کر دیا گیا۔ ملک کے اندر موجودہ عدالتی و قانونی نظام میں ضروری قرار دیا گیا ہے قتل کے کیس پہلے سیشن عدالت میں پیش کئے جائیں وہاں جو بھی فیصلہ ہو اس کے بارے میں ہائیکورٹ کے دو رکنی ڈویژن بنچ میں اپیل سنی جاتی ہے پھر اس فیصلے بارے میں مزید اپیل سپریم کورٹ میں جاتی ہے۔ یوں تین عدالتوں میں ہو کر فیصلہ حتمی شکل اختیار کرتا ہے۔ یہ سلسلہ اس لئے اختیار کیا جاتا ہے۔ کہ کسی شخص کی زندگی کے بارے میں عجلت میں کوئی غلط فیصلہ نہ ہو جائے۔ ہائیکورٹ کو ہر طرح کے فیصلوں اور اقدامات کے وسیع اختیارات حاصل ہیں مگر پوری عدالتی تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسا واقعہ سامنے آیا ہو کہ ہائیکورٹ نے براہ راست قتل کے کسی مقدمے کی سماعت کی ہو۔ بھٹو کیس کے فیصلے کے متنازعہ ہونے کے بارے میں دوسری وجہ ہائیکورٹ نے براہ راست قتل کے کسی مقدمے کے سماعت کی ہو۔ بھٹو کیس کے

فیصلے کے متنازعہ ہونے کے بارے میں دوسری وجہ ہائیکورٹ کا یہ اقدام بھی شامل ہے کہ اس نے سیشن عدالت کو کیس کی سماعت کا موقع نہیں دیا۔ یہ کیس سیشن عدالت میں ہوتا تو اس کے بارے میں ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ تک دو اپیلیں کی جا سکتی تھیں مگر کیس براہ راست ہائیکورٹ میں آ جانے سے ایک اپیل کا چانس ضائع کر دیا گیا۔ یہ بات انصاف کے تقاضوں کے برعکس تھی یہ بات بھی سامنے آ چکی ہے کہ پہلے روز جسٹس مشتاق حسین نے بھٹو کو عدالت میں طلب کیا وہ کھڑے تھے کہ کسی شخص نے ان سے کوئی بات کی ۔جسٹس مولوی مشتاق حسین نے ڈانٹ دیا کہ مسٹر تم کٹہرے میں کھڑے ہو کر کسی سے بات نہیں کر سکتے۔ بھٹو نے کہا کون سا کٹہرا؟ یہاں تو کوئی کٹہرا نہیں! اس پر راتوں رات لکڑی کا ایک کٹہرا بنوایا گیا۔ اگلے روز بھٹو کو اس کٹہرے میں اس طرح کھڑا کیا گیا کہ دونوں طرف پولیس اور انٹیلی جنس کے اہلکار کھڑے کر دیئے گئے اور عملی طور پر بھٹو کو کسی شخص سے بات کرنے سے روک دیا گیا۔ ان دنوں لاہور ہائیکورٹ ایک قلعہ کا منظر پیش کرتی تھی۔ ہائیکورٹ کی پوری طویل چار دیواری کے باہر پولیس کا زبردست پہرا، اندر چار دیواری کے ساتھ ساتھ چاروں طرف لوہے کی خاردار باڑ، ہائیکورٹ بار ایسوسی ایشن میں صرف وکلاء جا سکتے تھے۔ ان کے لئے ہر وقت کالا کوٹ پہننا ضروری تھا۔ عام عدالتوں میں ملزموں اور گواہوں کو نہ کوئی پابندی تھی اور نہ کوئی پاس لینے پڑتے تھے۔ بھٹو کیس والی عدالت میں جانے کے لئے خصوصی پاس جاری ہوتے تھے۔ انہیں حاصل کرنے کے لئے بڑے بڑے وکلاء قطاروں میں دھکے کھاتے تھے۔"

بھٹو کے کیس میں چار بے گناہوں کی پھانسی

بھٹو کے خلاف کیونکہ کوئی Direct evidence نہیں تھی اس لئے اس میں کچھ Confessions حاصل کر کے کیس تیار کیا گیا تھا۔ سب سے پہلے ایف ایس ایف کے ڈائریکٹر جنرل مسعود محمود کو پکڑا گیا۔ اور زبردست دباؤ سے اسے وعدہ معاف گواہ بنایا گیا۔ اس کے ایک ماتحت افسر اور پولیس انسپکٹر وغیرہ کو اس شرط پر ملزم بنایا گیا کہ ان کو سزا نہیں دی جائے گی اور بھٹو کی پھانسی کے بعد ان کو معاف کر دیا جائیگا۔ معلوم نہیں کس دباؤ یا لالچ میں ان کو رضامند کیا گیا۔ ان کے نام میاں عباس۔ غلام مصطفیٰ۔ رانا افتخار احمد اور ارشد اقبال تھے۔ ان سے بیان لئے گئے کہ انہوں نے مسعود محمود کے حکم کے تحت قتل کی کارروائی کی تھی۔ مسعود محمود کی تو مولوی مشتاق نے وعدہ معاف گواہ کی بنیاد پر جان بخشی کر دی اور وہ امریکہ چلا گیا۔ دیگر چاروں کو فوری طور پر چھوڑا نہ گیا اور پھانسی کا حکم دیا گیا۔ ان کو کہا گیا کہ بھٹو کی پھانسی

ہو جانے پر ان کی سزا ختم کر دی جائیگی۔ چنانچہ ان کو بھٹو کے ساتھ پھانسی نہ دی گئی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد جب جنرل ضیاء اور مولوی مشتاق میں ناراضگی ہو گئی تو کسی نے جنرل ضیاء کو سمجھایا کہ ان کو بھی ختم کر دیا جائے ورنہ یہ کسی وقت ان کے خلاف گواہ بن سکتے ہیں مجھے وہ دن یاد ہے جب میں محکمہ قانون میں ایڈیشنل سیکرٹری تھا ہماری بلڈنگ کے سامنے چیف سیکرٹری اور ہوم سیکرٹری کا دفتر تھا تو اچانک سو دو سو آدمیوں کا ہوم سیکرٹری اور چیف سیکرٹری کے کمروں کے باہر مجمع شور مچا رہا تھا گالیاں نکال رہا تھا۔ ہم لوگ نکل کر گئے تو ہمیں بتایا گیا کہ یہ لوگ ان چاروں سزا یافتہ ملزمان کے عزیز اور متعلقین ہیں جن کو اچانک یہ بتایا گیا ہے کہ یہ ان چاروں کو یعنی میاں عباس وغیرہ کو اگلے روز پھانسی دے دی جائیگی۔ جبکہ ان سے وعدہ کیا گیا تھا کہ ان کی سزا معاف کر دی جائیگی۔ یہ ہنگامہ دو تین گھنٹے ہوا لیکن پھر پولیس نے قابو پایا کچھ لوگوں کو گرفتار کر لیا اور کچھ لوگوں کو بھگا دیا۔ اگلے روز واقعی ان چاروں کو بھی پھانسی دے دی گئی۔ اس طرح جنرل ضیاء نے اس بات کے امکان کو ختم کر دیا کہ یہ چاروں اسکے خلاف کبھی گواہ بن سکتے ہیں۔

نصر صاحب سے ملاقات اور ان کی وفات

مجھے نصر صاحب اور جسٹس صفدر شاہ کو ملنے کی بہت خواہش تھی جس کا ذکر میں نے چوہدری ظفر الٰہی سے کیا اور انہیں ملاقات کرانے کے لئے کہا ایک روز چوہدری صاحب نے مجھے بتایا کہ جسٹس صفدر شاہ آئے ہوئے ہیں دوپہر کے بعد ان کے دفتر آ جاؤں وہ ملاقات کروانے کی کوشش کرینگے۔ میں گیا تو پتہ چلا کہ جج صاحب تو اچانک اسلام آباد چلے گئے ہیں۔ لہٰذا صرف نصر صاحب سے ملاقات ہو سکی۔ تقریباً 2 گھنٹے گپ شپ رہی اس میں انہوں نے ان تمام واقعات کو کنفرم کیا جو مجھے چوہدری ظفر الٰہی کے ذریعے ان کے متعلق معلوم ہوئے تھے۔ نصر صاحب نے مجھے اجازت دی کہ میں پھر بھی جب چاہوں ان کو دفتر میں ملنے کے لئے آ سکتا ہوں لیکن افسوس کہ ان سے دوسری ملاقات صرف ان کی وفات پر میو ہسپتال لاہور ان کی میت دیکھنے پر ہوئی۔ وہ اسلام آباد سے لاہور کار میں آ رہے تھے گاڑی وہ خود Drive کر رہے تھے ساتھ ان کی بیگم بیٹھی تھیں۔ اور پچھلی سیٹ پر ڈرائیور بیٹھا تھا۔ گوجرانوالہ گزر کر جب وہ ایمن آباد موڑ پر پہنچے تو ایک تیز رفتار ویگن سے ٹکر ہو گئی۔ نصر صاحب تو موقع پر ہی ہلاک ہو گئے۔ ان کی بیگم زخمی ہوئیں۔ ڈرائیور بالکل بچ گیا۔ اس نے فوراً لاہور چوہدری ظفر الٰہی کو فون پر اطلاع دی۔ چوہدری صاحب فوراً ایک دو دفتر کے آدمیوں کو لیکر اپنی کار میں جائے حادثہ پر پہنچے۔ بیگم کو چوٹیں معمولی تھیں اس لئے ان کو

اور نصر صاحب کو لیکر لاہور میو ہسپتال لے آئے۔ مجھے پتہ چلا تو میں میو ہسپتال پہنچا کچھ لوگ لوکل ایڈمنسٹریشن اور نصر صاحب کے دوست یا واقف کار بھی پہنچے شام تک جسٹس صفدر شاہ صاحب بھی آ گئے۔ میت کو غسل وغیرہ دیکر ائیر پورٹ لے جایا گیا جنازہ کا اعلان کر دیا گیا تھا کہ رات 9 بجے ائیر پورٹ پر ہوگا کیونکہ وہاں پر دس بجے رات جہاز پر اسلام آباد روانہ ہونا تھا۔ اس پروگرام کے مطابق میں بھی ائیر پورٹ پہنچا جنازہ پڑھ کر ان کی میت کو اسلام آباد روانہ کر کے واپس آ گیا۔ البتہ چوہدری ظفر الٰہی میت کے ساتھ اسلام آباد گئے۔ جج صاحب اور کچھ لوگ بھی اسی جہاز میں اسلام آباد چلے گئے۔

جسٹس صفدر شاہ کے خلاف کارروائی

جسٹس صفدر شاہ کی ضیاء الحق کی سازش میں شمولیت سے انکار پر ضیاء الحق نے اس کے خلاف کارروائی کرنے کا حکم دیا۔ اور تو کوئی شکایت ان کے خلاف نہ مل سکی کسی نے الزام لگایا کہ ان کا Matriculation کا سرٹیفکیٹ جعلی تھا اس کے ثبوت کی کوشش تو کی گئی لیکن ناکامی ہوئی۔ جسٹس صفدر شاہ لنکن ان (Lincoln Inn) لندن سے پاس شدہ بیرسٹر تھے۔ اس لئے ان کے خلاف میٹرک کے سرٹیفکیٹ جعلی ہونے کا الزام ایک مضحکہ خیز اور بہت گھٹیا حرکت تھی۔ جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو اس کے خلاف سپریم جوڈیشل کونسل میں ریفرنس دائر کر دیا گیا۔ جس میں کچھ چھوٹے الزامات لگائے گئے علاوہ ازیں اسے اور اس کی فیملی کو بعض دوسرے طریقوں سے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ یہ Victimisation کی انتہا تھی۔ جسٹس صفدر شاہ کو خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں ان کو یا ان کی بیوی بچوں کو مروا نہ دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی بیوی کو انگلینڈ بھجوا دیا۔ ان کے دو لڑکے لاہور میں پڑھ رہے تھے۔ انہیں ہوسٹل سے اٹھوا کر نصر صاحب کے دفتر کی بلڈنگ کی اوپر کی منزل میں جو دو Suites بنائے ہوئے تھے جن میں نصر صاحب اور جسٹس صفدر شاہ ٹھہرا کرتے تھے وہاں شفٹ کر دیا۔ سپریم جوڈیشل کونسل میں جب ریفرنس دائر ہوا تو جسٹس صفدر شاہ نے استعفیٰ دے دیا اور کچھ عرصہ بعد چوری چھپے پاکستان سے نکل کر انگلینڈ چلے گئے۔ انہوں نے انصاف کرنے کی سزا پائی۔

(اقتباسات ''مبالغہ نہ مغالطہ'' تاریخ اشاعت 2006ء
میاں محمد ارشد سابق سیشن جج سیکرٹری قانون پنجاب اور مشیر قانون وفاقی محتسب)